تدبرِ قرآن

٢١

الانبیاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ —— سورہ طٰہٰ —— کی مثنیٰ ہے۔ جس مضمون پر سورۂ طٰہٰ ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیت میں کفارِ قریش کو یہ تنبیہ ہے کہ اگر تم کوئی نشانیٔ عذاب ہی دیکھنے پر اڑے ہوئے ہو تو انتظار کرو، اب اس عذاب کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اس سورہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے، بعینہٖ اسی مضمون سے فرمایا کہ ان لوگوں (کفارِ قریش) کے حساب کی گھڑی بالکل سر پر آچکی ہے لیکن یہ اپنی سرمستیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ پیغمبر کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے اور اللہ کی آیات کا استہزا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ان کا سارا اعتماد ان کے خود تراشیدہ معبودوں پر ہے۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں محض ان کے وہم کی ایجاد ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ سابق سورہ میں صرف حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا حوالہ تھا اس میں دوسرے انبیاءِ عظام علیہم السلام کا بھی حوالہ ہے اور نہایت واضح الفاظ میں غلبۂ حق اور فتح مکہ کے قرب کی پیشین گوئی کی گئی ہے جو کفارِ قریش کے لیے ایک آخری تنبیہ اور مسلمانوں کے لیے کشمکشِ حق و باطل کے اس شدید ترین دور میں ایک عظیم بشارت ہے۔

سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سابق سورہ کی طرح یہ سورہ بھی تین بڑے حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے قریش کو ان کی ان لاالفضولیوں پر نہایت واضح الفاظ میں تنبیہ و وعید ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت لاابالیانہ انداز میں وہ کر رہے تھے، پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں سے ان تمام حقائق کو مبرہن کیا گیا ہے جن کی قرآن کے ذریعہ سے ان کو دعوت دی جا رہی تھی، آخر میں اسی مضمون کو، جو شروع میں بیان ہوا ہے بعینہٖ اسی تمہید کے ساتھ از سرِ نو لے لیا ہے اور نہایت فیصلہ کن انداز میں مخالفین کو اس انجام سے آگاہ کیا ہے جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔

اگرچہ سورہ کا عمود اور نظام واضح کر دینے کے لیے یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم مزید وضاحت کے لیے سورہ کے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۵) قریش کو انذار کرنے رسول کی بعثت کے بعد، سنتِ الٰہی کے مطابق، اب ان کی قسمت میزان میں اور ان کے محاسبہ کا دن ان کے سر پر ہے لیکن یہ اپنی بدمستیوں میں کھوئے ہوئے خطرہ سے آگاہ کرنے والے رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کوئی ان کو ساحر بناتا ہے کوئی کاہن، کوئی اس کی وحی کو خواب پریشان سے تعبیر کرتا ہے، کوئی اس کو مفتری اور شاعر قرار دیتا ہے اور اس سے اگلے انبیاء کے سے خوارق و عجائب، کا مطالبہ کرتا ہے حالانکہ تاریخ اور اہلِ علم گواہ ہیں کہ انبیاء ہمیشہ اسی طرح کی وحی کے ساتھ آئے جس طرح کی وحی کے ساتھ ان کا رسول آیا۔ ان پر اتمامِ حجت کے لیے جس یاددہانی کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس آگئی۔ اب اگر یہ اس کو ٹھکراتے ہیں تو ان قوموں کے انجام کو یاد کر لیں جن کے پاس ان کے رسول آئے اور انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ انھوں نے بھی اسی تمسخر کے ساتھ اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا، پھر جب وہ اس کے نتیجہ میں خدا کی پکڑ میں آگئیں تو کوئی ان کا پناہ دینے والا نہ بنا اور ہم نے ان کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

(۱۶-۲۹) اس حقیقت کی یاددہانی کہ اس دنیا کے خالق نے اس کو محض اپنا جی بہلانے کے لیے کوئی تھیئٹر نہیں بنایا ہے کہ حق و باطل اور نیکی و بدی دونوں کی حیثیت اس میں یکساں ہو بلکہ اس کا خالق ایک عادل و حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک دن لائے جس میں حق کا بول بالا ہو اور باطل کا وہ کچومر نکال دے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء اس کو خدا کے عدل کی گرفت سے بچا لیں گے تو یہ اس کا محض ایک وہم باطل ہے۔ خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں، جو بھی ہیں سب اس کے آگے سرنگندہ ہیں۔ اگر اس کائنات میں کئی ارادوں اور مشیتوں کی کارفرمائی ہوتی تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتی۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی تعلیم میں اس شرک کا کوئی شائبہ نہیں۔ ہر نبی نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے۔ اگر کسی نے خدا کے لیے بیٹیاں فرض کر کے ان کو خدا کے ہاں اپنا سفارشی سمجھ رکھا ہے تو یہ محض خود فریبی ہے۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے اس کے اذن کے بدوں زبان نہیں کھول سکتے، وہ صرف اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اگر کوئی بھی خدائی کا مدعی نکلا تو خدا اس کو جہنم میں جھونک دے گا۔

(۳۰-۳۳) نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کے جواب میں نظامِ کائنات کی چند نہایت واضح نشانیوں کی طرف اشارہ کہ اگر ان کو نشانیوں کی طلب ہے تو آخر وہ ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر وقت ان کے سامنے موجود اور خدا کی ربوبیت و رحمت، اس کے عدل و حکمت اور توحید و معاد کی گواہی دے رہی ہیں۔ انہی چیزوں کی دعوت ان کو پیغمبر دے رہا ہے تو جب اس کی تائید میں یہ سارے شواہد موجود ہیں تو کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت باقی رہی۔

(۳۴-۴۴) ان لوگوں کو جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اس بنا پر مذاق اڑا رہے تھے کہ آپ نہ تو بشریت

سے کوئی مافوق ہستی تھے اور نہ کوئی مال دار آدمی۔ ان کے باب میں فرمایا کہ اگر یہ پیغمبرؐ کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑا لیں لیکن یاد رکھیں جب خدا کی پکڑ میں آجائیں گے تو ان کے یہ دیوی دیوتا ان کی کوئی مدد نہ کرسکیں گے جن کی حمیت حمایت میں یہ خدا کے رسول کی توہین کر رہے ہیں۔

(۴۴-۴۷) متکبرین کے اصل سبب غرور کی طرف اشارہ اور یہ پیشین گوئی کہ یہ مکہ میں جس دعوت حق کو دبانے کے لیے زور آزمائی کر رہے ہیں وہ دعوت اطراف کے سے مکہ کی طرف بڑھ رہی ہے اور بہت جلد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ دعوت غالب رہتی ہے یا اس کے یہ اعداء۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کہ میں تو تمھیں وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن تمھارے بہرے کان اس کو نہیں سن رہے ہیں، اگر خدا کے تازیانۂ عذاب کی زد میں آگئے تو پھر اپنے سر پیٹو گے۔

(۴۸-۷۷) ایک صعودی ترتیب کے ساتھ جلیل القدر انبیاء میں سے حضرت موسٰی، حضرت ابراہیم (بشمول حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب) اور حضرت نوح علیہم السلام کی تعلیم و دعوت اور ان کے جھٹلانے والوں کے انجام کی طرف اشارہ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان تمام انبیائے عظام کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے اور لازماً اس کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان انبیاء کی مخالفت کرنے والوں کا ہوا۔

(۷۸-۸۶) ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاء کا ذکر جو شکر اور صبر کے نہایت کڑے امتحانوں میں ڈالے گئے اور وہ ان میں سو فی صد کامیاب رہے۔ پہلے زمرہ میں سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا حوالہ دے کر قریش کو انہی کی طرح خدا کا شکر گزار بندہ بننے کی دعوت دی ہے۔ دوسرے زمرے کے انبیاء میں سے خاص طور پر حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود ان کا حوالہ دینے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کی حوصلہ افزائی ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے ان صابر بندوں کو ان کے صبر کے سلسلہ میں اپنی رحمت سے نوازا اسی طرح اگر تم بھی مصائب کے مقابل میں حق پر ثابت قدم رہے تو اللہ تم کو بھی اپنی رحمت سے نوازے گا۔

(۸۷-۹۱) ان انبیاء کی طرف ایک اجمالی اشارہ جن کے لیے نہایت تاریک اور بظاہر مایوس کن حالات کے اندر خدا کی قدرت و حکمت کی نہایت حیرت انگیز شانیں ظاہر ہوئیں۔ اس زمرہ کے انبیاء میں سے حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحیٰی اور حضرت مریم و حضرت مسیح علیہم السلام کا حوالہ دیا ہے اور مقصود اس سے اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ خدا جب اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہے گا تو کوئی چیز اس کے ارادے میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔ حالات و اسباب سب اس کے اختیار میں ہیں۔

(۹۲-۱۱۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کو مزید مؤکد کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اطمینان دلا دیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت و تعلیم یہی رہی ہے جو تم دے رہے ہو تو تم اپنے کام میں لگے رہو اور

جن لوگوں نے اس میں اختلافات پیدا کیے اور پیدا کر رہے ہیں ان کے معاملہ کو بہانے اور پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ خدا کے عذاب کو دیکھ کر ہی ایمان لائیں گے لیکن اس وقت کا ایمان لانا بالکل بے سود ہو گا۔ آخرت کی کامرانی صرف اللہ کے نیک بندوں ہی کے لیے ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فیصلہ کن اعلان کہ اب فیصلہ کی گھڑی سر پر ہے، جس کو فائدہ اٹھانا ہو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھائے پھر یہ فرصت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ آخری آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دعا کہ اے رب! اب میرے اور ان اعدائے حق کے درمیان تو فیصلہ فرما دے!

یہ سورہ کے مطالب کا سرسری تجزیہ ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ (٢١)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ١١٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ١-١٥ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ﴿١﴾ مَا يَاْتِيْهِمْ
مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٢﴾ لَاهِيَةً
قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿٣﴾ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ
الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٤﴾ بَلْ قَالُوْٓا
اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ
كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿٥﴾ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ
اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٧﴾ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ
جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿٨﴾ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ
الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٩﴾
لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠﴾ ع ١ وَ

كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا
آخَرِينَ ﴿١١﴾ فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ﴿١٢﴾
لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُسْأَلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿١٤﴾ فَمَا زَالَتْ
تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ﴿١٥﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۵

لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت قریب آلگا ہے اور یہ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کیے جارہے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے جو تازہ یاددہانی بھی ان کے پاس آتی ہے یہ اس کو بس مذاق کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں مدہوش ہیں اور ان ظالموں نے آپس میں یہ سرگوشی کی کہ یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہیں تو کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو میں پھنسو گے! ۱-۳

اس نے کہا میرا رب آسمان اور زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے اور وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۴

بلکہ انھوں نے کہا، یہ تو خواب پریشان ہیں، بلکہ اس کو انھوں نے گھڑ لیا ہے، بلکہ یہ ایک شاعر ہیں۔ پس یہ ہمارے پاس اس طرح کی کوئی نشانی لائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق رسول بھیجے گئے تھے۔ ۵

ان سے پہلے کسی بستی کے لوگ بھی، جس کو ہم نے ہلاک کیا، ایمان لانے والے نہ بنے، تو کیا یہ لوگ ایمان لانے والے بنیں گے! اور تم سے پہلے جس کو بھی ہم نے رسول بنا کر بھیجا آدمیوں ہی میں سے بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ تو اہلِ علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے اور ہم

نے ان کو ایسے جسم بھی نہیں دیے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ابدی زندگی رکھنے والے بھی نہ تھے۔ پھر ہم نے ان سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ان کو اور جن کو ہم چاہتے ہیں نجات دی اور حدود سے تجاوز کر جانے والوں کو ہلاک کر دیا۔ ۶-۹

اور ہم نے تمھاری طرف بھی ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمھارے حصّہ کی یاددہانی ہے تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جن کے لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے اور ان کے بعد دوسرے لوگ اٹھا کھڑے کیے۔ پس جب انھوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو لگے وہاں سے بھاگنے۔ ہم نے کہا، اب بھاگو مت، اپنے عیش کے سامانوں اور اپنی عیش گاہوں کی طرف پلٹو تاکہ تم سے پرسش ہو۔ انھوں نے واویلا کیا کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! وہ یہی واویلا کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو خس و خاشاک اور راکھ کے مانند کر دیا۔ ۱۰-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ مُّعْرِضُوْنَ (۱)

سابق سورہ کے مضمون کی تکمیل

یہ سورہ بغیر کسی تسمیہ و تمہید کے شروع ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ درحقیقت اسی انذار کے مضمون کی تکمیل ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ سابق سورہ کی آخری آیات اور اس سورہ کی ابتدائی آیات نے ایک حلقۂ اتصال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سورۂ برأت کی تفسیر میں ہم اس نوع کے اتصال کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

للناس سے مراد مشرکین مکہ ہیں

'لِلنَّاسِ' سے مراد، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے مشرکین مکہ ہیں۔ یہ لوگ چونکہ خدا کی یاددہانی سے اعراض پر اڑے ہوئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے اعراض کرتے ہوئے عام لفظ سے ان کا ذکر فرمایا۔ اس اسلوب بیان سے ایک قسم کی نفرت، و کراہت اور حسرت کا اظہار ہو رہا ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایک سنت الٰہی کی یاددہانی

'لوگوں کے لیے ان کے محاسبہ کا وقت بالکل قریب آگیا ہے' یہ محض ایک دھمکی نہیں بلکہ بیان واقعہ ہے،

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ اس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو اس کے لیے ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اگر وہ یہ راہ نہیں اختیار کرتی تو اتمامِ حجت کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ اسی سنتِ الٰہی کی روشنی میں فرمایا کہ رسول کی بعثت و دعوت کے بعد ان مشرکین کا یوم الحساب بھی بالکل قریب آلگا ہے لیکن یہ بدستور غفلت میں پڑے ہوئے، رسول کی تذکیر و تنبیہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ یہاں بیک وقت ان کی دو حالتوں کا ذکر ہے، ایک غفلت، دوسری اعراض۔ غفلت یعنی زندگی کے اصل حقائق سے بے پروائی، بجائے خود بھی انسان کی شامت کی دلیل ہے اور ایک بہت بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم اس صورت میں بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب کوئی اللہ کا بندہ جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہو لیکن لوگ ایسے غفلت کے ماتے ہوں کہ اس کی کوئی نصیحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ (۲)

تازہ تازہ یاد دہانی

فرمایا کہ ان کے اندر غفلت اور لاابالی پن کے ساتھ سرمستی اور شرارت بھی ہے کہ ان کو بار بار گوناگوں پہلوؤں اور اسلوبوں سے یاد دہانی کی جا رہی ہے لیکن جو تازہ تذکیر و تنبیہ بھی ان کے پاس آتی ہے اس کو سنجیدگی کے ساتھ سننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے اس کو ہنسی مسخری میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں فرمایا ہے۔ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۔۱۱۳ (اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا اور اس میں اپنی وعید گوناگوں پہلوؤں سے واضح کر دی کہ وہ خدا کے غضب سے بچیں یا یہ ان کے اندر ہماری یاد دہانی کو تازہ کر دے) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے صرف ایک بار ان کو سنا دینے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ان کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے تازہ تازہ یاد دہانیاں بھیجیں لیکن وہ متنبہ ہونے اور ان کی قدر کرنے کے بجائے ہر تذکیر کو اپنے مذاق کا موضوع بنا لیتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (۳)

قریش کے لیڈروں کی سخن سازیاں

'لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ' دوسرا حال ہے، مطلب یہ ہے کہ دل کا اصلی کام تفکر و تذکر ہے لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کے دل اپنی دلچسپیوں میں ایسے کھوئے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات اور بڑی سے بڑی حقیقت کو بھی یہ مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ قریش کے لیڈروں اور ان کے دانشوروں کی وہ باتیں نقل ہو رہی ہیں جو وہ اپنی مجالس میں قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے لوگوں کے اندر پھیلاتے تھے۔ ان کو یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ قرآن کی دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگ اس سے متاثر ہو رہے

ہیں۔ اس اثر کو مٹانے کے لیے انھوں نے لوگوں کے اندر یہ وسوسہ اندازی شروع کی کہ یہ نہ سمجھو کہ ان کے کلام میں یہ زور و اثر اس چیز کا نتیجہ ہے کہ یہ کوئی فرستادے ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ یہ بھی تمھارے ہی جیسے انسان ہیں، اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتے یا کسی اور مخلوق کو اپنا رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو! اور یہ جو ان کے کلام میں زور و تاثیر اور فصاحت و بلاغت محسوس کرتے ہو یہ بھی محض اس شخص کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، جس طرح ہمارے دوسرے شاعر اور خطیب اپنی جادو بیانی سے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اسی طرح یہ شخص بھی اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو تمھاری یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی اگر تم جانتے بوجھتے اس شخص کے جادو میں پھنس گئے!

یہ اشغلے چونکہ لیڈر لوگ خاص اپنی مجالس میں ایجاد کرتے تھے اور وہیں سے القاء ہو کر یہ لوگوں کے اندر پھیلتے تھے، اس وجہ سے ان کو 'نجویٰ' سے تعبیر فرمایا ہے اور 'الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' کے الفاظ سے یہ ظاہر فرما دیا کہ یہ وسوسہ اندازیاں کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے خود اپنے اوپر بھی ظلم کیا کہ اپنے دل و دماغ معطل کر لیے اور دوسروں کے اوپر بھی ظلم کر رہے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

'سحر' سے مراد اور قرآن کو سحر کہنے کی وجہ

'اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ' میں سحر سے مراد وہ کلام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سناتے تھے۔ اہل عرب اس کلام کو جس میں غیر معمولی تاثیر و تسخیر ہو سحر سے تعبیر کرتے تھے۔ زور و اثر رکھنے والے کلام کے لیے یہ تعبیر ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ جہاں تک قرآن مجید اور آنحضرت صلعم کے ارشادات کی فصاحت و بلاغت اور سطوت و جلالت کا تعلق ہے وہ ایسی چیز تھی کہ اس کا انکار مخالفین بھی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اس وجہ سے وہ مجبوراً اس کا اعتراف کرتے۔ البتہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ زور و تاثیر اس چیز کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے یا اس کا پیش کرنے والا خدا کا کوئی رسول ہے بلکہ یہ تمام تر الفاظ کی جادوگری اور زورِ خطابت کی ساحری ہے تو جانتے بوجھتے، دیکھتے سنتے اس شخص کے جادو میں نہ پھنسو۔ 'وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ' کا ٹکڑا لوگوں کے اندر احساس برتری ابھارنے کے لیے ہے کہ تم کوئی بھولے بھالے اور سادہ لوح لوگ نہیں بلکہ سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ ہو اس وجہ سے تمھیں اس فریب میں نہیں آنا چاہیے۔

قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۫ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (۴)

تفویض الی اللہ

یہ اس ردعمل کا بیان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کی اس بکواس کا ہوا۔ آپؐ جانتے تھے کہ یہ اشغلے محض لوگوں کو ورغلانے کے لیے وہ لوگ ایجاد کر رہے ہیں جن پر قرآن کا حق ہونا اچھی طرح واضح ہے اس وجہ سے آپؐ نے ان لوگوں کو خطاب کیے بغیر معاملہ اللہ کے حوالہ کیا کہ میرا رب آسمان و زمین میں ہونے والی ہر بات کو جانتا ہے، وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سرگوشیاں جن نہاں خانوں میں بھی ہو رہی ہیں اور یہ فتنے جو لوگ بھی ایجاد کر رہے ہیں، میرا رب ہر بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تو جب وہ جانتا ہے تو وہی اس کے تدارک کا سامان بھی فرمائے گا۔ میں اس معاملہ کو اپنے رب ہی کے حوالہ کرتا ہوں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۵)

'اضغاث احلام' کا مفہوم — 'اضغاث'، ضغث کی جمع ہے۔ 'ضغث' گھاس کی اس مٹھی کو کہتے ہیں جو رطب و یابس اور خشک و تر دونوں کا مجموعہ ہو۔ یہیں سے 'اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی خواب پریشان کے ہیں یعنی وہ خواب جو معنی و مفہوم سے بالکل خالی اور اپنے الجھاؤ کے سبب سے اس قابل نہ ہوں کہ ان کی تاویل و تعبیر کی طرف کوئی توجہ کی جائے اور ان کو کوئی اہمیت دی جائے۔

فرمایا کہ بات یہیں تک نہیں رہی ہے کہ یہ لوگ پیغمبر کی وحی کو سحر کہتے ہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو خواب پریشان سے تعبیر کرتے ہیں، اس کو افترا قرار دیتے ہیں، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک شاعر بتاتے ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر یہ خدا کے پیغمبر ہیں تو اس کے ثبوت کے لیے اسی طرح کی کوئی نشانی یہ بھی دکھائیں جس طرح کی نشانیوں کے ساتھ سابق انبیاء آئے۔

قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے جو آپ پر خدا کے مقرب فرشتہ جبریل امین کے واسطہ سے نازل ہوتی تھی۔ مخالفوں نے جب یہ محسوس کیا کہ قرآن کے متعلق اس دعوے نے بھی اس کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور لوگ اس کو انسانی کلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدائی الہام کی حیثیت سے قبول کر رہے ہیں تو اس کا توڑ کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کلام کے وحی الٰہی ہونے کا دعویٰ محض واہمہ کی خلاقی ہے۔ یہ خوابہائے پریشان کا مجموعہ ہے۔ جو خیالات اس شخص کے ذہن میں رچے بسے ہوتے ہیں وہی اس کو سوتے میں خواب میں نظر آتے ہیں اور یہ ان کو (العیاذ باللہ) عوام فریبی کے لیے اس دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ خدا نے ایک فرشتہ کے ذریعہ سے وحی نازل کی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دور حاضر کے بعض ملاحدہ نے بھی وحی کو ایک مشکوک چیز ٹھہرانے کے لیے بعینہٖ یہی بات کہی ہے جو عرب کے ان اشرار نے کہی تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ عرب کے جہلا نے یہ بات ناتراشیدہ انداز میں کہی اور اس زمانے کے مدعیان عقل نے اس کو ایک فلسفہ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ آخری گروپ کی سورتوں میں ہم اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

آنحضرت صلعم پر ایک شاعر ہونے کی تہمت — 'بَلِ افْتَرٰىهُ' یعنی اس قرآن کو افترا بھی قرار دیتے ہیں۔ اس کو افترا قرار دینے سے ان کا مدعا یہ تھا کہ ہے تو ان کے (آنحضرتؐ کے) اپنے ذہن کی ایجاد لیکن (العیاذ باللہ) یہ جھوٹ موٹ محض ہم پر اپنی دھونس جمانے کے لیے اس کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

'بَلْ هُوَ شَاعِرٌ' یعنی یہ ایک شاعر ہیں اور ان کے اس کلام کی ساری سحر آفرینی اس نوعیت کی ہے جس نوعیت کی سحر آفرینی ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ان کو اور ان کے کلام کو اہمیت دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب کا تصور یہ تھا کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر القا کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر

کہ کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ نعوذ باللہ آپ کے ساتھ بھی کوئی جن ہے جو یہ کلام آپ پر القا کرتا ہے۔

مخالفین پر قرآن کا رعب — قرآن کے مخالفین کی ان باتوں سے ایک امر تو بالکل واضح ہے کہ وہ اس کی ہیبت و جلالت سے سخت مرعوب تھے اور یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ لوگوں کے دلوں پر سے اس کے رعب کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ البتہ ان کی یہ کوشش تھی کہ لوگوں پر اس کے خدائی کلام ہونے کی جو ہیبت بیٹھتی جا رہی ہے اس کو کسی طرح کم کریں کہ لوگ اس کو وحی والہام کا درجہ نہ دیں بلکہ بشری و انسانی کلام ہی کے درجے میں رکھیں۔

معجزات کی نشانی کا مطالبہ — 'کَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ' کے بعد 'بِالْاٰیٰتِ' قرینہ کی دلالت کی بنا پر حذف ہے۔ یعنی جب وہ یہ محسوس کرتے کہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ اوٹ پٹانگ باتیں لوگوں کے دلوں میں اترنے والی نہیں ہیں تو یہ مطالبہ کرتے کہ اگر یہ رسول ہیں تو یہ بھی اسی طرح کی کوئی نشانی دکھائیں جس طرح کی نشانیاں پہلے آنے والے رسولوں نے دکھائیں۔ نشانی سے ان کی مراد اس طرح کے حسی معجزات یا عذاب کی نشانیاں ہیں جن کا ذکر دوسرے انبیاء کی سرگزشتوں کے سلسلہ میں آیا ہے۔ ان کا یہ حربہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، ان کے زعم کے مطابق، سب سے زیادہ کارگر حربہ تھا اس لیے کہ قرآن کی دعوت تمام تر آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی تھی۔ وہ معجزات و خوارق اور نشانیٔ عذاب کے بجائے لوگوں کو آنکھیں کھولنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے پر ابھارتا تھا کہ ایمان کا فطری راستہ عقل و دل کا راستہ ہے۔ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے وہ خوارق دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے اور عذاب کی نشانی دیکھ کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ بات بالکل برحق تھی لیکن مخالفین اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریز پر محمول کر کے لوگوں کو ورغلاتے کہ دیکھو، اگر یہ سچ مچ کوئی رسول ہوتے تو ان کے لیے ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دینا کیا مشکل تھا! لیکن جب یہ اس سے گریز کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اپنے دعوے میں (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ (۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی — یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ ان کی ان خرافات کی پروا نہ کرو۔ یہ ضد اور ہٹ دھرمی کی اسی روش پر چل پڑے ہیں جس پر ان سے پہلے ہلاک ہونے والی قومیں چلیں۔ جس طرح انھوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور اس کی پاداش میں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اسی طرح ان کے لیے بھی ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ انھوں نے ہر قسم کی نشانیاں دیکھیں لیکن ایمان کی راہ اختیار نہ کی تو ان سے کس طرح توقع رکھتے ہو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی گئی تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے! یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اسی طرح اندھے بنے رہیں گے جس طرح آج اندھے اور بہرے بنے ہوئے ہیں!

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۷)

رسولوں کا اصل وصف امتیازی — اوپر آیت ۳ میں مخالفین کا یہ اعتراض نقل ہوا ہے، 'هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ' (یہ تو تمھارے

ہی مانند ایک بشر ہیں) یہ اسی اعتراف کا جواب ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا بلکہ تم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں سب بشر ہی تھے کبھی خدا نے غیر بشر کو رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ رسولوں کو جو امتیاز حاصل تھا وہ یہ نہیں کہ وہ مافوق بشر تھے بلکہ صرف یہ کہ ہم ان کے پاس اپنی وحی بھیجتے تھے،، اسی طرح کی وحی جس طرح کی وحی ہم تمھارے پاس بھیجتے ہیں، جس کی مخالفت میں یہ لوگ یہ بکواس کر رہے ہیں۔

دشمن کی گواہی

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ - اوپر والے ٹکڑے میں خطاب کا رخ آنحضرت صلعم کی طرف تھا۔ یہ براہ راست مخالفین و معترضین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم اس بات سے بے خبر ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لو جن کو پہلے خدا کی کتاب ملی اور وہ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ اشارہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف ہے۔ ان کو گواہ بنانا دشمن کو گواہ بنانے کے ہم معنی ہے اس لیے کہ اس دور میں، جیسا کہ پچھلی سورتوں سے واضح ہو چکا ہے، اہل کتاب من حیث الجماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور قریش کی حمایت کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔ قرآن نے ان کو گواہ بنا کر قریش پر حجت تمام کر دی کہ اس حقیقت سے انکار تو تمھارے حامیوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن اہل کتاب کو بھی نہیں ہو سکتا تو انہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے! یہاں اہل کتاب کو اہل کتاب کے بجائے اَهْلَ الذِّكْرِ سے تعبیر کرنے میں یہ بلاغت ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں اندھے ہو جانے کی بات تو اور ہے لیکن ان میں سے جن کو اپنے نبیوں اور رسولوں کی یاد ہو گی وہ اس بدیہی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

قریش پر ایک تعریض

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کے الفاظ کے اندر قریش پر ایک تعریض بھی ہے کہ ہر چند یہ بات معلوم تو تمھیں بھی ہونی چاہیے کہ تم ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے خلف اور وارث ہونے کے مدعی ہو جو بہر حال بشر ہی تھے مافوق بشر نہیں تھے، لیکن تمھیں اگر یہ بات امی ہونے کے سبب سے بھول گئی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ کر اپنی یادداشت تازہ کر لو جن کو کم از کم یہ بات تو نہیں بھولی ہو گی کہ جتنے رسول بھی آئے سب بشر ہی تھے، کوئی بھی فرشتہ نہیں تھا۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (۸)

کوئی نبی مافوق بشر نہیں ہوا

یعنی وہ تمام انبیاء بھی اسی طرح کی بشری خصوصیات کے ساتھ آئے تھے جس طرح کی بشری خصوصیات تمھارے اندر ہیں۔ نہ تو ان کو ایسے جسم ملے تھے جو کھانے پینے کی ضرورت سے مستغنی ہوں اور نہ وہ زندۂ جاوید ہو کر آئے تھے۔ وہ بھی انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے تھے اور انھیں بھی اسی طرح موت سے دوچار ہونا پڑا جس طرح ہر بشر کو اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ اعتراض دوسری جگہ اس طرح نقل ہوا ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا ——— یہ تو بس تمھارے ہی مانند ایک بشر ہیں۔ جو تم کھاتے ہو

تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُونَ (المومنون۔ ۳۳-۳۴)

وہی یہ کھاتے ہیں اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتے ہیں تو اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو رسول مان لوگے تو بڑے گھاٹے میں رہوگے۔

کسی نبی کو حیاتِ جاوداں نہیں ملی

'وَمَا كَانُوا خٰلِدِيْنَ' میں ان کے اس زعم کی تردید ہے کہ رسول کو زندہ جاوید ہونا چاہیے۔ اسی سورہ میں آگے اس خیال کی تردید یوں فرمائی گئی ہے۔ 'وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُونَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۲۱-۳۴-۳۵) یعنی ہم نے تم سے پہلے کسی انسان کو بھی، خواہ وہ نبی ہو یا غیر نبی، حیاتِ جاوداں نہیں بخشی، اگر تمھیں موت آنی ہے تو یہ بھی ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں، ہر نفس کو بہر صورت موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ موت تو اس زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے جس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ نبی کو بھی اس مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ چیز نہ اس کی نبوت کے لیے قادح ہے، اور نہ اس کو نبی ماننے میں دوسروں کے لیے کوئی کسرِ شان کی بات ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (۹)

ہر رسول کی تکذیب کرنے والے ہلاک ہوئے

'وَعْد' سے مراد وہی وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے فرمایا کہ اگر لوگ تمھاری تکذیب کر دیں گے تو ہم تمھاری تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کر دیں گے اور تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو نجات دیں گے۔ ہم یونس ۲۰ کے تحت واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جو اس دنیا میں رسول کی تکذیب کر دینے والی قوم پر لازماً آتا ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جو آخرت میں ہوگا۔ یہاں پہلا عذاب مراد ہے۔ فرمایا کہ یہ تھے تو وہ بہر حال بشر ہی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا کر دکھایا یعنی ان کو اور جن کو ہم چاہیں نجات دی اور ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو حدود سے تجاوز کر جانے والے تھے۔ یہاں 'مَنْ نَّشَآءُ' کے اسلوبِ بیان نے کلام کو مطابقِ حال کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صرف ماضی کی حکایت نہیں ہے بلکہ اس وقت تمھارے سامنے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اگر تم نے اپنی ضد سے ہمارے عذاب کو دعوت دی تو ہم اس سے نجات انہی لوگوں کو دیں گے جن کو چاہیں گے۔ ہماری اس مشیت میں کوئی دوسرا دخیل نہ بن سکے گا اور نہ کوئی ہماری پکڑ سے بچ سکے گا۔ 'مُسْرِفِيْنَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کی حدود کو ڈھٹائی کے ساتھ توڑتے ہیں اور رسول کے انذار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کے باغی قرار پاتے ہیں اور باغیوں کی سرکوبی لازماً ہو کے رہتی ہے۔

لَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰)

یاددہانی کے لازمی نتائج

یعنی جس طرح ہم نے پچھلی قوموں پر ان کے ہلاک کرنے سے پہلے ان کی تذکیر کے لیے رسول بھیجے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اسی طرح تمھارے اوپر بھی ایک کتاب اتار دی ہے جس میں تمھیں اچھی طرح یاددہانی کر دی ہے۔ اب تم ہمارے سامنے یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تمھیں یاددہانی نہیں کی گئی۔ یہ یاددہانی اپنے لازمی نتائج اپنے ساتھ

رکھتی ہے جو سنت الٰہی کے مطابق بہر حال ظاہر ہو کے رہیں گے۔ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں ہے کہ اگر تم نے رد کر دی تو یہ رد ہو جائے گی بلکہ اس کو رد کر دینے کا وہی نتیجہ تمہارے سامنے آکے رہے گا جو تم سے پہلے دوسری قوموں کے سامنے آچکا۔ خدا کی جو سنت آج تک جاری رہی ہے وہ تمہارے معاملے میں بدل نہیں جائے گی۔ 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' یہاں سخت تہدید و وعید کے سیاق میں ہے کہ نادانو، تمہاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے! کیوں اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو! اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنے کے لیے سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۳۳-۱۳۵ کے تحت جو وضاحت کی گئی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۱۱)

تاریخ کا حوالہ

یہ پچھلی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح تم اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو کہ خدا کی یاد دہانی کا مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں یہی حرکت کر چکی ہیں جس کی پاداش میں ہم نے ان کے پرخچے اڑا دیے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسی جرم کے تم مرتکب ہو رہے ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا وہی معاملہ تمہارے ساتھ نہ کرے جو اس نے ان کے ساتھ کیا۔

'وَكَانَتْ ظَالِمَةً' یہاں 'ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ' کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے ان کے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والی بنیں۔ خدا نے اپنے رسول بھیج کر ان کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔ لیکن انھوں نے اپنی رعونت کے سبب سے خود اس خطرے کے بند کو توڑا۔

قوموں کے ایک مغالطہ کی تردید

'وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ' یعنی خدا کے لیے ایک قوم کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری قوم کو برپا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے وجود کو اس دنیا کے لیے ناگزیر نہ سمجھے کہ اس کے اجڑنے سے خدا کی دنیا اجڑ جائے گی۔ جب کوئی قوم بغاوت کی روش اختیار کرے گی خدا اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لائے گا اور دیکھے گا کہ وہ کیا روش اختیار کرتی ہے۔ اگر وہ بھی وہی روش اختیار کرے گی تو بالآخر اس کا بھی وہی حشر ہو گا —— افراد ہوں یا اقوام جب ان پر خدا سے بے پروائی غالب ہوتی ہے، تو وہ اپنے وجود کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں۔ یہاں اسی مغالطہ کو دور فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز نہ سمجھو، خدا جب چاہے گا، یہاں جھاڑو پھر دے گا اور تمہاری جگہ دوسروں کو لا بسائے گا۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۱۲)

خدا کی پکڑ سے کوئی پناہ نہیں

یعنی جس طرح آج تم بڑے طنطنہ کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے ہو اسی طرح انھوں نے بھی بڑی رعونت کے ساتھ خدا کے عذاب کو دعوت دی بالآخر جب ہمارے عذاب نے ان کے دروازوں پر دستک دے دی تو اس کے مقابلہ کے لیے وہ کوئی تدبیر نہ کر سکے بلکہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن خدا کے عذاب سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ وہ جب دبوچ لیتا ہے تو اس کے چنگل سے کوئی نہیں نکل سکتا!

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (۱۳)

ایک طنزیہ اسلوب یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے یعنی خدا کی گرفت نے اپنی زبانِ حال سے ان سے کہا کہ اب کہاں بھاگتے ہو! اب بھاگو مت، بھاگنے کا وقت گزر گیا! خدا کی بخشی ہوئی جن رفاہیتوں میں اب تک عیش کرتے اور اپنے جن محلوں اور ایوانوں میں بیٹھ کر خدا کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے رہے ہو، ان میں جاؤ تاکہ تمھاری اچھی طرح مزاج پرسی ہو! لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ یہاں طنز و تضحیک کے مفہوم میں ہے۔ طنز و تضحیک کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی ہے۔ سخت اظہارِ غضب کے مواقع میں ہم بھی باندازِ طنز یوں کہتے ہیں کہ ٹھہرو، ابھی میں تمھاری مزاج پرسی کرتا ہوں، ابھی تمھاری خبر لیتا ہوں، ابھی پوچھتا ہوں۔ قرآن کے دوسرے مواقع میں بھی یہ اسلوب استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیت ۸۔ تکاثر اور آیت ۹۲۔ نحل میں۔

'اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رفاہیت و نعمت کی فراوانی تمھیں بخشی تو گئی خدا کی طرف سے تاکہ تمھاری شکر گزاری کا امتحان ہو لیکن تم اس کو اپنے اب و جد کی میراث اور اپنے استحقاقِ ذاتی اور اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھے اور اس کے بل پر اسی خدا سے تم نے بغاوت کی جس کے فضل سے تمھیں یہ نعمتیں حاصل ہوئیں تو اب اس کا مزہ چکھو۔ یہاں خطاب چونکہ امراء و اغنیاء سے ہے اور 'مساکن' کا ذکر ان کے اسبابِ عیش و رفاہیت کے ذکر کے بعد ہے اس وجہ سے 'مساکن' سے مراد انھی امراء کے ایوان و محل ہیں۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۱۴-۱۵)

بعد از وقت اعتراف یعنی جب عذاب نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے واویلا شروع کیا اور بول اٹھے کہ بے شک ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اور ہم نے یہ شامت خود بلائی۔ لفظ 'ظلم' کے اس مفہوم کی طرف اوپر آیت ۱۱ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ اعتراف انھیں اس وجہ سے کرنا پڑا کہ اس عذاب سے پہلے خدا کے رسول نے انھیں اچھی طرح خبردار کر دیا تھا لیکن وہ نہ صرف اندھے بہرے بنے رہے بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے رہے۔ بالآخر جب وہ سر پر آ دھمکا تو انھیں ماننا پڑا کہ سارا قصور ان کا اپنا ہے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ الاٰیۃ۔ 'دَعْوٰى' کے معنی چیخ و پکار اور استغاثہ و فریاد کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ان کی وہی چیخ و پکار ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ یعنی وہ اسی طرح چیخ پکار کرتے ہی رہ گئے، ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی اس لیے کہ عذاب آ جانے کے بعد چیخ پکار بے سود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان کو کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ کی مانند کر دیا۔ 'کاٹی ہوئی گھاس اور بجھی ہوئی آگ' کے استعارے میں یہ مضمون مضمر ہے کہ جس طرح گھاس کاٹ کر اس کے خشک انبار میں آگ لگا دی جائے اور وہ راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے اسی طرح ہم نے ان کو خاک اور راکھ بنا دیا۔ لفظ 'خٰمِدِيْنَ' یہاں استعارہ کی رعایت سے آیا ہے اور یہ عربی کا معروف اسلوب ہے۔

۲- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۶-۲۹

آگے اسی بات کی دلیل بیان ہوئی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دنیا میں قوموں کا جو محاسبہ ہوتا ہے اور آگے قیامت میں جو ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے اس طرح کا کوئی تھیئٹر نہیں بنایا ہے جس طرح کے تھیئٹر دنیا کے بادشاہ اپنے جی بہلانے کے لیے بناتے ہیں بلکہ یہ اس نے اپنے فضل و رحمت اور حق و عدل کے ظہور کے لیے بنائی ہے۔ اس فضل و رحمت اور حق و عدل کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس میں اس کے بندے شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ خدا کے نظام حق و عدل کے پابند ہو کر زندگی گزاریں اور یہ یوں ہی چلتی نہ رہے بلکہ اس کے بعد ایک ایسا یوم الحساب بھی آئے جس میں وہ لوگ اپنی کارکردگی کا صلہ پائیں جو اس دنیا کے خالق کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور وہ لوگ کیفر کردار کو پہنچیں جو اس میں دھاندلی مچائیں۔ اگر کسی ایسے یوم الحساب کے بغیر اسی طرح یہ دنیا چلتی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے جس نے محض اپنی تفریح کے لیے یہ کھیل رچائی ہے اس کو اس کے خیر و شر اور عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ خیال بالبداہت باطل اور خدا کی صفات عدل و رحم کے بالکل منافی ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے۔ اسی سلسلہ میں شرک کی تردید بھی فرمائی اس لیے کہ اگر شرک کی کوئی گنجائش باقی رہے تو اس صورت میں بھی یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک کھیل تماشہ بن کے رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود تسلیم کر لیا جائے جو خدا کے معاملات میں اتنے دخیل ہوں کہ وہ اپنے پجاریوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر یہ روز عدالت آیا بھی تو اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ سفارشیوں کے ذریعہ سے اس عدالت سے چھوٹا جا سکتا ہے اور سفارش کے لیے ان کے یہ مزعومہ شرکاء و شفعاء ان کے نزدیک کافی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۶-۲۹ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ
نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ
الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ
عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ

يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا
ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ
فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ
اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿٢٥﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ
وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ
بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ
اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَمَنْ يَّقُلْ
مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ
ع نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۲۹

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے ۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے ۔ اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے ! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمھارے لیے اس چیز کے سبب سے ، جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے ! ۱۶-۱۸

اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے نہ سرتابی کرتے اور نہ تھکتے ۔ وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور دم نہیں لیتے ۔ ۱۹-۲۰

کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں، وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔ تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں! وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے باب میں کسی کے آگے مسئول نہیں اور یہ سارے مسئول ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کے ماسوا دوسرے معبود ٹھہرا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ تعلیم ہے ان لوگوں کی جو میرے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کی بھی جو مجھ سے پہلے ہوئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر حق سے بے خبر ہیں اس وجہ سے اعراض کیے جا رہے ہیں۔ اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے ان کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔ ۲۱-۲۵

اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمان کے اولاد ہے، وہ ان باتوں سے ارفع ہے، بلکہ وہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے، وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کے آگے اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے سب سے باخبر ہے۔ اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لیے جس کے لیے اللہ پسند فرمائے۔ اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں اور ان میں سے جو بھی مدعی بنے گا کہ اس کے سوا میں الٰہ ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیں گے۔ ۲۶-۲۹۔

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۱۶)

جزا و سزا کے لازم ہونے کی دلیل

اوپر جو بات جزا و سزا کے لازمی ہونے سے متعلق فرمائی گئی ہے یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اگر اس دنیا کے پیچھے کوئی روزِ جزا و سزا نہیں ہے، یہ یوں ہی چلتی آئی ہے اور یوں ہی ہمیشہ چلتی رہے گی، کوئی نیکی کرے یا بدی، ظلم کرے یا انصاف، اس کے خالق کو اس کے خیر و شر سے کوئی بحث نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ

اس نے یہ محض اپنا جی بہلانے کے لیے ایک کھیل تماشا بنایا ہے، جب تک وہ چاہے گا اس سے جی بہلائے گا اور جب اکتا جائے گا اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا اور اپنی دلچسپی اور اوقات گزاری کے لیے کوئی نیا کھیل ایجاد کرے گا۔ فرمایا کہ ہم نے اس آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزوں کو اس طرح کے کسی کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ یہ کارخانۂ کائنات اپنے وجود سے شاہد ہے کہ یہ ایک عادل و حکیم اور رحمان و رحیم کا بنایا ہوا کارخانہ ہے۔ نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، نہ یہ دیوتاؤں کی رزمگاہ ہے اور نہ یہ کسی بھگوان کی لیلا ہے بلکہ اس پُر حکمت کارخانہ کی ایک ایک چیز شاہد ہے کہ اس کے خالق نے اس کو ایک عظیم مقصد و غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کے عدل و حکمت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے، جس میں اس کا مقصد ظہور میں آئے۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۱۷)

کھیل اور کارِ عبث خدا کی صفات کے منافی ہے۔

فرمایا کہ اول تو اس قسم کا کھیل اور کارِ عبث ہماری شان اور ہماری اعلیٰ صفات کے منافی ہے لیکن بالفرض ہم ایسا کرنے والے ہی ہوتے تو اپنے پاس ہی سے اس کا سرو سامان مہیا کر لیتے، اس میں اپنے بندوں اور بندیوں اور اپنی دوسری مخلوقات کو کیوں گھسیٹتے! ہم اس کتاب میں روم کے قدیم سلاطین کے متعلق کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ وہ اپنے تھیٹروں میں بھوکے شیروں اور اپنے مظلوم غلاموں کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھتے تھے۔ العیاذ باللہ یہی رائے اس کائنات کے خالق کے متعلق قائم کرنی پڑے گی اگر وہ اپنی تمام مخلوقات کو اس ابتلاء میں ڈال کر ان کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی، سرکش و باغی بھی ہیں اور وفادار و تابعدار بھی، ناشکرے اور نابکار بھی ہیں اور حق شناس و شکرگزار بھی۔ ایسی حالت میں اگر اس دنیا کے لیے کوئی روزِ عدل نہیں ہے تو پھر یہ روم کے سلاطین کے ایک تھیٹر کے مانند ہے۔ اس آیت میں اسی بے ہودہ خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اپنی مخلوقات کے ساتھ خدا کا جو تعلق ہے وہ اس بات کو واجب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں حق و باطل کا فیصلہ ہو، حق سربلند ہو اور باطل نابود۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور یہ چیز خدا کی صفات کے منافی ہے۔

'لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ' کے چند لفظوں کے اندر جس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم کوئی کھیل تماشا بنانا ہی چاہتے تو ہم اس کا سرو سامان اپنے پاس ہی سے کر لیتے، اس کے لیے آدم و ابلیس، حق و باطل، ہدایت و ضلالت، عدل و ظلم، خیر و شر، اور ظلم و مظلومی کی یہ رزمگاہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی! یہ بات خدا کے عدل و رحم کے بالکل منافی ہے کہ وہ ایک رزمگاہ میں اپنے بندوں اور بندیوں کو اتار دے اور خود ایک تماشائی بن کر صرف اس کا تماشہ دیکھے، نہ ان لوگوں کو انعام دے جو اس جہاد میں کامیاب و سرخرو ہوں اور نہ ان لوگوں کو سزا دے جو اپنی ساری زندگی باطل کی پرستش اور اس کی حمایت میں گزاریں۔

'اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ' میں خدا کی نسبت اسی باطل تصور کی تردید ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اسی باطل تصور کی بنا پر دنیا کی مشرک قوموں نے اس کائنات کو اپنے دیوتاؤں کی ایک تماشہ گاہ قرار دیا اور ہندو فلسفیوں نے اس کو بھگوان کی لیلا سے تعبیر کیا۔ ان کے ہاں چونکہ قیامت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے خیال کیا کہ جس

طرح دنیا کے بادشاہ اپنی تفریح کے لیے تھیئٹر بناتے ہیں اسی طرح ان کے غیبی دیوتاؤں نے یہ دنیا بنائی ہے اور وہ اس میں کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم، کسی کو قاتل اور کسی کو مقتول بنا کر اس کا تماشہ دیکھتے اور اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمارے اس زمانے کے منکرین و ملاحدہ اگرچہ زبان سے تو یہ بات نہیں کہتے کہ یہ کہنے میں نہایت بھونڈی ہے لیکن جب وہ قیامت اور ایک روزِ عدل و انصاف کو نہیں مانتے تو ان کے دل کے اندر بھی اصلاً یہی تصورِ باطل گھسا ہوا ہے اس لیے کہ انکارِ قیامت کے معنی دوسرے لفظوں میں یہی ہیں کہ یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال ہے۔ قیامت کو مانے بغیر اس کائنات کی کوئی ایسی توجیہ ممکن ہی نہیں ہے جو اس کو حق و عدل پر مبنی قرار دے سکے۔ ان دونوں میں اسی طرح کی نسبت ہے جس طرح کی نسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اگر جوڑے کے ایک فرد کو اس کے دوسرے جزو سے الگ فرض کر کے اس کی توجیہ کرنا اور اس کے داعیات و مقتضیات کی حکمت معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ (۱۸)

'دمغ' کے معنی کسی کو اس طرح مارنے اور زخمی کرنے کے ہیں کہ وہ اس کا بھیجا نکال دے۔

اصل حقیقت کا بیان

فرمایا کہ تم جو اس دنیا کو ایک کھیل تماشہ سمجھے بیٹھے ہو، یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اس میں ہم نے حق کے ساتھ باطل کو جو مہلت دے رکھی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ ہمارے نزدیک حق و باطل دونوں یکساں ہیں بلکہ یہ محض تمھارے امتحان کے لیے ہے کہ دیکھیں کون حق کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون باطل کا پرستار بنتا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جب تم دیکھو گے کہ ہم حق کا ہتھوڑا باطل کے سر پر اس طرح ماریں گے کہ وہ باطل کا بھیجا نکال کر رکھ دے گا اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ دماغ پر ضرب کاری آدمی کو آناً فاناً ختم کر دیتی ہے اسی طرح یہ ضرب کاری باطل کو چشم زدن میں نابود کر دے گی۔

'وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ' یعنی اس وقت تمھاری اس بکواس کے سبب سے جو تم آج کر رہے ہو تمھارے لیے صرف تباہی اور ہلاکی ہی ہوگی۔ 'مِمَّا تَصِفُونَ' سے ہمارے نزدیک مراد ان کا دنیا سے متعلق یہ تصور بھی ہے کہ یہ محض ایک کھیل تماشا ہے، اور ان کے شرک و شفاعت کا وہ عقیدہ بھی ہے جس کے سبب سے وہ آخرت سے بالکل نچنت ہو کر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ بالفرض آخرت سے سابقہ پیش ہی آیا تو ان کے شرکاء و شفعاء ان کو ہر خطرے سے بچا لیں گے۔ فرمایا کہ تمھاری یہ تمام باتیں موجبِ وبال اور سببِ ہلاکت بنیں گی۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (۱۹-۲۰)

شرک کے واہمہ کی تردید

اوپر کی آیات میں جزا و سزا کے واجب ہونے پر صفاتِ الٰہی سے استدلال تھا۔ اب یہ توحید کا بیان

آرہا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کردی جائے کہ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ اپنے شرکاء و شفعاء کی سفارش سے خدا کی پکڑ اور جزا و سزا سے بچ جائے گا تو یہ محض اس کا وہم ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب خدا ہی کی مخلوق اور اسی کے مملوک ہیں کسی کو خدا کے ہاں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔

فرشتوں کا حال

'وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ'۔ 'مَنْ عِنْدَهٗ' سے مراد خدا کے مقرب ملائکہ ہیں۔ فرمایا کہ وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہیں۔ باہمہ قرب و شرف ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ اس کی عبادت سے کبھی سرتابی کرتے، نہ کبھی اس سے تھکتے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں فرض کر کے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ان کو خدا کے ہاں بڑا مرتبہ و مقام حاصل ہے، جو بات چاہیں اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں اور خدا ان کی نازبرداری میں ان کی ہر خواہش کی لازماً تعمیل کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کی نعمتوں کو بھی انہی کا عطیہ سمجھتے اور آخرت کے باب میں بھی ان کا خیال تھا کہ اگر بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو ان کی بدولت وہاں بھی ان کو بڑا درجہ حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ تم تو ان کے بل پر خدا سے اکڑتے ہو لیکن خود ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ کبھی خدا کی بندگی سے سرتابی کرتے اور نہ کبھی اس کام میں وہ کوئی تکان محسوس کرتے، وہ شب و روز خدا کی تسبیح و تہلیل میں سرگرم رہتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں توقف نہیں کرتے۔

أَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ○ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۱ - ۲۲)

'انشر اللہ الارض' کے معنی یہ ہوں گے، خدا نے زمین کو اس کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سر نو زندہ و شاداب کر دیا، مثلاً فرمایا ہے۔ 'وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا' (زخرف - ۱۱) (اور جس نے اتارا آسمان سے پانی ایک خاص اندازہ کے ساتھ پس ہم نے اس سے شاداب کر دیا خشک زمین کو)

زمین و آسمان کا رب ایک ہے

یہ مشرکین کے ایک دوسرے مشرکانہ واہمہ کی تردید ہے۔ بہت سے مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ زمین اور آسمان کے الٰہ الگ الگ ہیں۔ وہ ایک رب العرش کو مانتے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ رب العرش اپنے عرش آسمان پر براجمان ہے، زمین میں دوسرے خداؤں کی خدائی چل رہی ہے۔ اسی وہم کے تحت وہ آسمان کے خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے زمینی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ اہل عرب کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تصور یہ تھا کہ زمین چونکہ رب العرش کی مملکت کا ایک بہت بعید علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام و انصرام، دوسروں کے حوالہ کر کے وہ اس سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ کیا انھوں نے زمین کے الگ الٰہ ٹھہرا لیے ہیں جو اس زمین کو زندگی بخشتے اور اس کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں؟ ان کا یہ خیال بالکل ہی باطل ہے۔ اگر آسمان و زمین میں خدا کے ماسوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو

کے رہ جاتے تھے۔ آخر آسمان والوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کے خشک و بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سرِ نو پر بہار کر دینے کے لیے پانی برساتے یا ان کی دوسری ضروریات کی فراہمی میں کوئی حصہ لیتے! توحید کی اس دلیل کی وضاحت دوسرے مقام میں 'دلیل توافق' کے عنوان سے ہم کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہوگی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کائنات کے بقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے مختلف اجزا و عناصر اور اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرا توافق ہے۔ اگر یہ توافق ایک لمحہ کے لیے بھی ختم ہو جائے تو اس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ توافق صریح طور پر اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اس پوری کائنات پر ایک ہی ذات کا ارادہ ([illegible]) کارفرما ہے۔ اگر اس میں بہت سے ارادے کارفرما ہوتے تو آسمان و زمین کا باقی رہنا ناممکن تھا۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ توحید کی یہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ خدائے رب العرش کے باب میں اس قسم کا تصور ایک احمقانہ تصور ہے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے ارفع اور پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ جب وہ اس کائنات کے تختِ حکومت کا مالک ہے تو اسی کا حکم آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب پر چل رہا ہے، پھر دوسروں کی کسی مداخلت کے فرض کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہی!

لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْـَٔلُوْنَ (۲۳)

سب خدا کے آگے مسئول ہیں

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان واضح فرمائی کہ وہ کسی کے آگے مسئول اور جواب دہ نہیں، باقی سب، خواہ فرشتے ہوں یا جن و انس، اس کے آگے جواب دہ ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے اور اگر کسی نے اس کی جرأت کی تو اس کو اللہ کے حضور میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور وہ اس جسارت کی سزا بھگتے گا۔ یہ مشرکین کے اس واہمہ کی تردید ہے کہ وہ اس کائنات کے نظم و نسق میں اپنے معبودوں کو دخیل سمجھ کر ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ خدا کے جس ارادے کو چاہیں بدلوا سکتے اور جو چاہیں اپنی مرضی سے کر سکتے ہیں، وہ خدا کی باز پرس سے بالاتر ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً ۭ قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَكُمْ ۚ ھٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔ (۲۴-۲۵)

توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت

یہ توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں تاریخ کی شہادت کا حوالہ ہے۔ اوپر کی مذکورہ دلیل توافق سے یہ ایک الگ اور مستقل دلیل ہے اس وجہ سے سوال 'اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً' کو پھر دہرایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو بھی مانتے ہیں تو ان سے کہو کہ یہ ان کے حق میں کوئی دلیل لائیں۔ شرک کے حامیوں سے دلیل کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو مابہ النزاع اور اختلافی چیز

نہیں ہے، اس کو تو یہ بھی مانتے ہیں اس وجہ سے وہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ اس کے سوا کچھ اور بھی معبود ہیں تو یہ محتاج دلیل ہے اور اس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری اس دعوے کے مدعیوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے حق میں اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کریں۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ : 'هٰذَا' یعنی یہ قرآن اپنے اندر وہ تعلیم بھی رکھتا ہے جو مجھ کو اور میرے ساتھ والوں (یعنی میری امت) کو دی گئی ہے اور اس میں وہ تعلیم بھی ہے جو مجھ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی۔ سب نے اسی توحید کی تعلیم دی ہے کسی نے بھی شرک کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اگر تمھارے پاس اس کے خلاف کوئی شہادت موجود ہے تو اس کو لاؤ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ : یعنی یہ بات نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے جس کی بنا پر یہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت میں آستین چڑھائے ہوئے ہیں بلکہ صرف حق سے بے خبری اور جہالت ہے جو اس سارے اعراض و انکار کا سبب ہے۔ یہ آنحضرت صلعم اور آپؐ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اس ہنگامۂ مخالفت سے تم آزردہ خاطر نہ ہو، جب مخالفت کی بنیاد دلیل و حجت پر نہیں بلکہ تمام تر بے خبری اور جہالت پر ہے تو اس مرض کا کیا علاج!

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

یہ اوپر والے ٹکڑے 'ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ' کی وضاحت ہے اور 'نُوْحِيْٓ' سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کو یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کیجیو۔ یہ امر واضح رہے کہ سابق انبیاء کے جو صحیفے موجود ہیں ان میں اگرچہ بے شمار تحریفیں ہو چکی ہیں لیکن توحید کی تعلیم آج بھی ان میں محفوظ ہے۔ ان کے حاملوں نے اگر شرک اختیار کیا ہے تو اپنے فاسد علم کلام کے سہارے پر اختیار کیا ہے نہ کہ ان صحیفوں کی تعلیم کی بنا پر۔ جس طرح قرآن کی نہایت واضح تعلیم توحید کے باوجود اس امت میں شرک کی بہت سی قسمیں گھس آئی ہیں۔ اسی طرح ان امتوں نے اپنے صحیفوں کی تعلیم کے بالکل برخلاف شرک کی لعنت اختیار کی اور پھر اس کے حق میں خارج سے دلیلیں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ تورات، انجیل، زبور وغیرہ کی تعلیمات کا حوالہ پچھلی سورتوں میں ہم دے چکے ہیں۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم بھی موجود ہے وہ بھی سرتاسر توحید ہے۔ الغرض حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و دعوت کا جو ریکارڈ موجود ہے، وہ قرآن کے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ کے ہر رسول نے توحید ہی کی تعلیم دی ہے، شرک کی تعلیم کسی نے بھی نہیں دی ہے۔ اس کے خلاف جو دعویٰ کرتا ہے وہ انبیاء کی تاریخ اور ان کی دعوت سے بالکل بے خبر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۶-۲۷)

خدا کے دربار میں فرشتوں کی حیثیت

یہ مشرکین کے باطل عقیدۂ شفاعت کی تردید ہے کہ وہ خدا کے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنائے بیٹھے ہیں۔ اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ اس دنیا میں جو رزق و فضل ان کو ملتا ہے انہی کی عنایت سے ملتا ہے اور اگر آخرت ہوئی تو انہی کی سفارش سے وہاں بھی یہ نہایت اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں گے۔ اس عقیدۂ باطل کی تردید یہاں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس پہلو سے فرمائی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قسم کی سفارش کی کوئی گنجائش مان لی جائے تو آخرت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا اس لیے کہ جب خدا کی عدالت میں رشوت یا سفارش سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنایا جا سکتا ہے تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے۔ پھر یہ کارخانہ مبنی بر حق و عدل کہاں رہا! اور اس کے خالق کو عادل اور حکیم کون مانے گا!

فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ اللہ جل شانہٗ بیٹوں، بیٹیوں اور بیوی بچوں کی نسبت سے پاک و ارفع ہے۔ اس قسم کی نسبتیں اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی ہیں۔ فرشتے خدا کی بیٹیاں نہیں ہیں، جیسا کہ یہ بے وقوف لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ اس کے باعزت بندے ہیں۔ ان کو خدا کے قرب کا مقام حاصل ہے لیکن یہ قرب ان کو اس لیے حاصل ہے کہ وہ شر سے بالکل پاک اور خدا کی بندگی اور وفاداری میں کامل العیار ہیں نہ اس لیے کہ وہ خدا سے جو چاہیں منوا لیتے ہیں۔

'لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی زور و اثر یا ناز و تدلل سے کوئی بات منوا لینا تو درکنار وہ خدا کے آگے بات کرنے میں پہل بھی نہیں کرتے۔ جب ان کو اذن ہوتا ہے تب وہ زبان کھولتے ہیں اور جو بات ان سے پوچھی جاتی ہے حدادب کے اندر اس کا جواب دیتے ہیں، اور ان کی یہ حیثیت بھی نہیں کہ بطور خود کسی کام کے لیے اقدام کر سکیں۔ وہ بس اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے ان کو دیا جاتا ہے۔ تو جن کی حیثیت خدا کے آگے یہ ہے ان سے یہ آس لگا بیٹھنا کہ وہ اپنے زور و اثر سے جس کو چاہیں گے خدا کی پکڑ سے چھڑا لیں گے یا جس درجے اور مرتبے پر اس کو چاہیں گے سرفراز کریں گے محض ایک احمقانہ آرزو ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ لا اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (۲۸)

'يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ'، یعنی ان کے آگے پیچھے اور حاضر و مستقبل میں جو کچھ ہے خدا ان ساری باتوں سے خود اچھی طرح واقف ہے اس وجہ سے نہ تو وہ کسی کے باب میں خدا کے علم میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی بات کو کچھ گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔

'وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى'۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ کسی کے بارے میں سفارش کے لیے خود سبقت نہیں کریں گے بلکہ جن کے لیے خدا پسند فرمائے گا صرف انہی کے لیے سفارش کریں گے۔

'وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ'۔ مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ وہ خدا کے خوف سے ہر وقت

لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں اس وجہ سے اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی خلافِ حق بات زبان سے نکالیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی سفارش پر جو لوگ تکیہ کیے بیٹھے ہیں وہ ان ساری باتوں کو سوچ لیں، محض ایک وہم کے سہارے پر اپنی عاقبت خراب نہ کریں۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (۲۹)

یعنی تم نے تو ان کو یہ درجہ دے رکھا ہے کہ گویا خدا ان کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، وہ اس کو جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے، اس کو اچھی طرح کان کھول کر سن لو، کہ اگر ان میں سے بھی کوئی کہیں یہ کہہ بیٹھے کہ خدا کے سوا وہ بھی ایک الٰہ ہے تو ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ یہی جہنم کی سزا ہے جو ہم نے تمام مشرکوں کے لیے ٹھہرا رکھی ہے وہی ہم ان کو بھی دے کے رہیں گے۔ یاد ہوگا کہ بعینہٖ یہی بات اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو خطاب کر کے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مائدہ کے باب میں بھی فرمائی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۰-۳۳

اوپر کی آیات میں معاد و توحید کی وہ دلیلیں بیان ہوئی ہیں جو عقل و فطرت اور صفاتِ الٰہی کے بدیہیات و مقتضیات پر مبنی ہیں۔ اب یہ نشانیوں کا مطالبہ کرنے والوں کو، جن کا ذکر آیت ۵ میں ہے، آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہ کسی نئی نشانی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، خدا کی یہ کائنات، اس کی قدرت، رحمت، ربوبیت، اور توحید و معاد کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے، ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے؟ جب وہ ان ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اگر کوئی نئی نشانی دکھا دی گئی تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی! دل میں ہدایت کے اترنے کی اصل راہ عقل ہے، جب انھوں نے عقل پر پٹی باندھ رکھی ہے تو ان کو ہدایت کس طرح نصیب ہو سکتی ہے! اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۰-۳۳
اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۰)
وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۱) وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا

مَّحۡفُوۡظًا ۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ
وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۳

کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا، تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں! اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ان پہاڑوں کے اندر ہم نے راستہ کے لیے درے بنائے تاکہ وہ راہ پائیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند بنائے۔ ان میں سے ہر ایک ایک خاص مدار کے اندر گردش کر رہا ہے۔ ۳۰-۳۳

---

۵ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا‌ ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ‌ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ (۳۰)

آفاق کی نشانیاں توحید، معاد اور جزا پر

'کَانَ' یہاں اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں 'کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا' میں ہے۔ 'رتق' کے معنی بند اور فتق کے معنی کھولنے کے ہیں۔ آسمان اور زمین کے بند ہونے اور ان کے کھولنے سے مقصود یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ دیکھتے ہو کہ آسمان بند ہوتا ہے، اس سے بارش نہیں ہوتی، اسی طرح زمین بند ہوتی ہے اس سے سبزہ نہیں اگتا، پھر دیکھتے ہو کہ آسمان کھلتا ہے اور اس سے دھڑا دھڑ پانی برسنے لگتا ہے اور اس کے بعد خدا زمین کو بھی کھول دیتا ہے اور وہ اپنی نباتات کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ کل تک زمین بالکل خشک اور مردہ پڑی ہوئی تھی لیکن بارش کے ہوتے ہی اس کے گوشے گوشے میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے۔

فرمایا کہ جو لوگ توحید و معاد کا انکار کر رہے ہیں اور قائل ہونے کے لیے کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آخر وہ آفاق کی ان نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز ان کے مشاہدے میں آ رہی ہیں۔ اللہ نے اپنی اس کائنات

ہیں یہ نشانیاں اسی لیے تو نمایاں فرمائی گئیں کہ لوگوں کو ان سے صحیح راہ کی طرف رہنمائی حاصل ہو!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی ایک مشاہدہ کے اندر ان تمام باتوں کی دلیلیں موجود ہیں جن کی قرآن ان کو دعوت دے رہا تھا۔

اس میں نہایت واضح دلیل توحید کی موجود ہے۔ اگر آسمان میں الگ الٰہ اور زمین میں الگ معبود ہوتے تو آسمان کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین کو زندہ و شاداب رکھنے کے لیے اپنے ذخیرے کا پانی صرف کرتا۔ زمین و آسمان میں یہ جیسی کی سی سازگاری اس بات کی صاف شہادت ہے کہ دونوں کا خالق و مالک ایک ہے اور دونوں پر اسی کا ارادہ کارفرما ہے۔

دوسری شہادت اس کے اندر معاد کی ہے۔ جب زمین خشک و بے آب و گیاہ، یا بالفاظ دیگر مردہ ہو کر از سر نو زندہ و شاداب ہو جاتی ہے تو موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو کیوں مستبعد خیال کیا جائے!

تیسری شہادت اس کے اندر انسان کے مسئول ہونے کی ہے۔ جب خدا نے انسان کی پرورش کے لیے یہ کچھ اہتمام فرمایا ہے کہ اپنے آسمان و زمین، سورج چاند، اور ابر و ہوا ہر چیز کو اس کی خاطر سرگرم کار رکھتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کو بالکل شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دے، محاسبہ کا کوئی دن اس کے لیے مقرر نہ کرے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا	اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا پس ہم
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝	نے اس سے اگائے باغ اور فصل کے غلے اور
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝	دراز قامت کھجوریں جن پر تہ بہ تہ خوشے نکلتے ہیں۔
رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً	بندوں کی روزی کے لیے۔ اور اسی پانی سے ہم نے
مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝	مردہ زمین کو بھی زندہ کر دیا۔ اسی طرح قبروں سے
(قٓ: ۹-۱۱)	نکلنا ہوگا۔

وَجَعَلْنَا فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۱)

پہاڑوں جیسی عظیم نشانیاں

'رواسی' عربی میں پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے اور یہ صفت ایسی مشہور ہو گئی ہے کہ موصوف کے قائم مقام کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔ 'اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ' میں 'ان' سے پہلے 'کراہیۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ 'فجاج'، 'فج' کی جمع ہے۔ 'فج' دو پہاڑوں کے درمیان کے شگاف کو کہتے ہیں۔

فرمایا کہ ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے جو اس کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں کہ مبادا وہ ان کے سمیت کسی سمت کو ڈھلک کر کسی اور کرہ سے جا ٹکرائے اور یہ اہتمام بھی کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان درے بنا دیے ہیں کہ وہ لوگوں کے راستہ کا کام دیں کہ وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو

آجا سکیں۔ اگر خدا نے ایسا نہ کیا ہوتا تو لوگ اپنے اپنے علاقوں ہی کے اندر بند ہو کے رہ جاتے اور کسی کے امکان میں بھی نہ ہوتا کہ وہ ان دیواروں کو توڑ کر سفر اور تجارت کی راہیں کھول سکے۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ کے اندر یہ مفہوم بھی ہے کہ لوگ ان راستوں سے رہنمائی حاصل کریں اور یہ مفہوم بھی ہے کہ خدا نے اپنی یہ عظیم نشانیاں اس لیے نمایاں فرمائیں کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھلیں، ان پر پہاڑوں کے خالق کی قدرت، عظمت اور حکمت کی شانیں واضح ہوں اور وہ خدا تک پہنچنے کی راہ پائیں۔ لیکن یہ انسان کا عجب اندھاپن ہے کہ وہ پہاڑ جیسے عظیم نشان سے تو کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرتا البتہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر اس کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ اس کو دکھا دیا جائے تو وہ ہدایت کی راہ اختیار کرے گا۔ آخر جو پہاڑ کو دیکھنے سے قاصر ہے اس کو تل کس طرح نظر آجائے گا! سورۂ قٓ میں ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا	اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ لنگر انداز
رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ	کر دیے اور اس میں نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں
بَهِيْجٍ ۙ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ	اگائیں۔ ہر متوجہ ہونے والے بندے کے اندر بصیرت
مُّنِيْبٍ (قٓ: ۷-۸)	اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے۔

اس آیت کے آخری الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ ان عظیم نشانیوں کے دکھانے سے قدرت کا اصل منشا یہ ہے کہ لوگوں کے اندر بصیرت پیدا ہو، ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ لیکن یہ نشانیاں نافع ان کے لیے ہیں جو ان کی طرف متوجہ ہوں۔ جن کے اندر متوجہ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی اندھے کے اندھے ہی رہ جاتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (۳۲)

آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف اشارہ

زمین کی بعض نمایاں نشانیوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ آخر یہ نشانیاں طلب کرنے والے آسمان کی اس ناپیدا کنار سقف نیلگوں کو کیوں نہیں دیکھتے جس کی وسعت و پہنائی کی کوئی حد نہیں لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کسی معمولی سے معمولی خلل کی بھی کوئی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ چھت کب بنی لیکن اس امتداد زمانہ کے باوجود نہ اس پر کوئی کہنگی طاری ہوئی، نہ اس میں کوئی نقص و خلل پیدا ہوا۔ ہر قسم کے دراڑ اور شگاف سے بالکل محفوظ یہ قائم و دائم ہے۔

یہی مضمون سورۂ قٓ میں یوں بیان ہوا ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ	کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف توجہ نہیں کی؟
كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ	ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو زینت دی
فُرُوْجٍ (قٓ: ۶)	اور کہیں اس میں دراڑ اور کوئی شگاف نہیں!

سورۂ ملک میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۝ (ملک: ۳-۴)	وہ ذات جس نے پیدا کیے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے رحمان کی اس صنعت گری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے۔ پس نگاہ دوڑاؤ، کیا تم کوئی خلل دیکھتے ہو؟ پھر دوبارہ نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ ناکام اور تھک ہار کر واپس آ جائے گی لیکن وہ کوئی خلل نہ پا سکے گی!

اس مضمون کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو ۹۹ بنی اسرائیل اور ۲۷-۳۲ نازعات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ بعض لوگوں نے 'محفوظ' سے یہ مراد لیا ہے کہ آسمان شیطان کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے لیکن اس کا ایک خاص محل ہے۔ یہاں یہ چیز زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو سورۂ ملک کی تفسیر میں ہم بحث کریں گے۔

'وَهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں تک نشانیوں کا تعلق ہے ان کی تو کوئی کمی نہیں ہے، اس کائنات کی ہر چیز نشانی ہے لیکن یہ نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں تو ایسے اندھوں کا کیا علاج!

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۳)

آسمان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آسمان کی نمایاں نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ وہی خدا ہے جس نے رات اور دن، سورج اور چاند پیدا کیے۔ ہر چند ان میں باہمدگر نسبت اضداد کی ہے لیکن یہ پورے توافق اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ اس کائنات کی خدمت میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہی قوتِ قاہرہ کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے۔ جو دنیا کے مجموعی مفاد کے لیے ان کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

'كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ'۔ 'کل' سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ ہم دوسرے محل میں ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ 'کل' جب اس طرح آتا ہے تو یہ معرفہ کے حکم میں ہوتا ہے اور اس سے مراد سابق الذکر چیزیں ہی ہوتی ہیں عام اس سے کہ وہ دو ہیں یا اس سے زائد۔ فرمایا کہ یہ سورج اور چاند اپنے اپنے معین مدار میں حرکت کرتے ہیں، مجال نہیں کہ سرمو ان سے منحرف ہو سکیں، اگر ذرا بھی ادھر ادھر ہو جائیں تو سارے نظامِ کائنات میں خلل واقع ہو جائے۔ منٹ اور سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ ان کا اپنی ڈیوٹی میں لگے رہنا اور بلا کسی ادنیٰ تخلف و توقف کے ہمیشہ لگے رہنا صاف اس بات کی شہادت ہے کہ حاکمِ کائنات کے محکوم اور اسی کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ اب یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے، جن کا دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں میں یہ مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی اور نشانی کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑی سفاہت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے سورج اور چاند کو بھی معبود بنا رکھا ہے درآنحالیکہ وہ رات دن اپنے محکوم و مسخر ہونے کی منادی کر رہے ہیں!

۶- آگے کا مضمون ــــ آیات ۳۴-۴۷

پیچھے آیت ۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ مخالفین اس بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑا رہے تھے کہ آپ رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ آپ بھی اسی طرح کے ایک بشر ہیں جس طرح کے عام بشر ہوتے ہیں اور مال و جاہ کے اعتبار سے بھی آپ کو کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ پھر وہ یہ کہتے کہ اگر ہم سے اپنی رسالت تسلیم کرانی ہے تو آپ کوئی ایسی نشانی دکھائیں جو یہ ثابت کر دے کہ فی الواقع آپ کی بات سچی ہے۔ اوپر کی آیات میں نشانیوں کے مطالبہ کا جواب دیا۔ اب آگے کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ان لوگوں کے استہزا کی پروا نہ کرو۔ اب وقت آ رہا ہے کہ یہ تمھاری ہر بات کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کی یہ ساری اکڑفوں ختم ہو جائے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾
۳۴-۴۷ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ
اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا
هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا
تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾
لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ
وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ
فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ
بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
ع ۳ ۱۱ ۲ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ
بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ

مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿٤٣﴾
بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا
يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٤٤﴾
قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ڮ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاۗءَ اِذَا مَا
يُنْذَرُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ
يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَـيْـــًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿٤٧﴾

ترجمۂ آیات ۳۴-۴۷

اور ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشہ کی زندگی نہیں بخشی تو کیا اگر تم مرجانے والے ہو تو یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں! ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمھاری واپسی ہونی ہے۔ ۳۴-۳۵

اور یہ لوگ جنھوں نے کفر کیا جب تم کو دیکھتے ہیں تو بس تم کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں، اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے! اور حال یہ ہے کہ یہ خدائے رحمان کے ذکر کے منکر ہیں۔ ۳۶

انسان عجلت کے خمیر سے پیدا ہوا ہے۔ تو میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا، تو تم مجھ سے جلدی نہ مچاؤ! اور یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو! کاش یہ کفر کرنے والے جان پاتے اس وقت کو جب کہ یہ عذابِ نار کو نہ اپنے چہروں سے دفع کر سکیں گے، نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ ان کی کسی طرف سے کوئی مدد ہوگی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آدھمکے گی اور

ان کو مبہوت کر دے گی۔ نہ وہ اس کو دفع ہی کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۳۷-۴۰

اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ ان سے پوچھو کہ رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے ؟ بلکہ یہ لوگ اپنے رب کی تنبیہ سے روگردانی کر رہے ہیں! کیا ان کے لیے ہمارے سوا کچھ اور معبود ہیں جو ان کو بچا لیں گے! نہ وہ خود اپنی مدد کر سکیں گے اور نہ ہمارے مقابل میں ان کی کوئی حمایت کی جا سکے گی! ۴۱-۴۳

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا یہاں تک کہ اسی حال میں ان پر ایک طویل مدت گزر گئی۔ تاہم کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف اس کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے بڑھ رہے ہیں تو کیا یہ لوگ غالب رہنے والے ہیں! ۴۴

کہہ دو، میں تو تمھیں بس وحی کے ذریعہ سے آگاہ کر رہا ہوں لیکن بہرے، جب وہ خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں، پکار کو نہیں سنتے۔ اور اگر تمھارے رب کے عذاب کا کوئی جھونکا ان کو پہنچ گیا تو پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! بے شک ہم اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۴۵-۴۶

اور قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے تو کسی جان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔ ۴۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ

الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۳۴ - ۳۵)

رسول کی بشریت پر اعتراض کرنے والوں کو جواب

آیت ۳ میں کفار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض گزر چکا ہے کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (یہ تو بس تمھارے ہی جیسے ایک بشر ہیں) یعنی جس طرح تم کھاتے پیتے ہو اسی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں اور جس طرح تم ایک دن مر جاؤ گے اسی طرح یہ بھی ایک دن مر جائیں گے تو اپنے ہی جیسے ایک انسان کو نبی و رسول ماننے کے کیا معنی؟ وہاں اس اعتراض کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا ہے۔ یہاں اسی اعتراض سے پھر تعرض فرمایا اور اعتراض کرنے والوں کے مافی الذہن پر ایک اور پہلو سے ضرب لگائی۔ فرمایا کہ نبی اور رسول ہونے کے لیے زندۂ جاوید ہونا ضروری نہیں۔ اگر تم کو موت آنی ہے تو تم سے پہلے ہر بشر کو خواہ نبی ہو یا غیر نبی، یہ آئی ہے اور ہر ایک کو آئے گی۔ تم سے پہلے کوئی بھی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس چیز سے محفوظ رہا ہو۔ اگر تم ایک دن وفات پاؤ گے تو یہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں ہیں۔ یہ بھی لازماً ایک دن اس موت سے دوچار ہوں گے۔ یہ موت تو لازمۂ بشریت ہے۔ اس کا مزا تو ہر ایک کو چکھنا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے اس اعتراض میں اگر کوئی وزن ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب یہ زندگئ جاوداں لے کے آئے ہوتے۔ اس وقت تو یہ کہہ سکتے تھے کہ بھلا ہم حیاتِ ابدی کے مالک ایک فانی انسان کو کس طرح رسول مان لیں لیکن جب یہ بھی فانی ہیں تو آخر رسول ان کو کیوں غیر فانی مطلوب ہے!

رسول کے لیے نہ مافوق بشر ہونا ضروری ہے نہ مال دار

'وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ' یہ اسی اعتراض کے ایک دوسرے پہلو کا جواب ہے۔ کفار جس طرح آپؐ کے بشر ہونے پر معترض تھے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے کہ اگر خدا کو کسی بشر ہی کو رسول بنانا ہوتا تو وہ مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، ان کو کیوں رسول بناتا جو مال و جاہ سے محروم ایک غریب آدمی ہیں۔ اس طعن کا جواب قرآن نے مختلف پہلوؤں سے جگہ جگہ دیا ہے۔ یہاں بھی اسی کا جواب ایک نئے انداز سے دیا ہے۔ فرمایا کہ رسول کے لیے جس طرح مافوق بشر ہونا ضروری نہیں اسی طرح اس کا صاحبِ مال و جائداد ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس دنیا میں امارت نہ کسی کے مقربِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے، نہ غربت اس کے حقیر ہونے کی دلیل ہے۔ اس دنیا میں غربت و امارت، دکھ اور سکھ، رنج اور راحت صرف امتحان کے لیے ہے۔ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا اور ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز فرماتا ہے۔ جب وہ کسی کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور جب فقر و غربت دیتا ہے تو اس کے صبر کا امتحان کرتا ہے۔ پھر سب کی واپسی خدا ہی کی طرف ہوگی اور وہ فیصلہ فرمائے گا کہ کس نے کمایا اور کس نے کھویا؟ مال و دولت پا کر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کا منظورِ نظر سمجھ بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ نبوت و رسالت کو بھی اپنا اجارہ خیال کرنے لگتے ہیں، وہ بالکل بر خود غلط ہیں۔

آیت میں لفظ 'فِتْنَةً' کو زمخشریؒ نے تاکیدِ فعل کے مفہوم میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ مفعول لہٗ ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۶)

مٹی کی مورتوں کے لیے غیرت مند اور خدائے رحمان کے لیے بے غیرت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جس انداز اور جس لب و لہجہ میں وہ مذاق اڑاتے، یہ اس کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ توحید اور قیامت کے یہ منکرین جہاں کہیں تمھیں دیکھ پاتے ہیں تمھارا مذاق اڑاتے ہیں اور بڑی تحقیر کے انداز میں کہتے ہیں کہ اچھا یہی ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے۔ 'ذکر کرتا ہے' یعنی برائی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ یَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ کے بعد بِالسُّوۡٓءِ کا لفظ برنباتے غیرت و حمیت وہ حذف کر دیتے۔ گویا اپنے بتوں کے لیے برائی کا لفظ اپنی زبان پر لانا انھیں بطور نقل کفر، بھی گوارا نہیں۔ 'یَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ' میں ضمیر خطاب اپنے عوام کو بھڑکانے کے لیے ہے۔ یوں نہیں کہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے بلکہ یوں کہتے کہ تمھارے معبودوں کی ہجو کرتا ہے۔ دونوں اسلوبوں کا فرق واضح ہے۔

'وَهُمۡ بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ': فرمایا کہ مٹی اور پتھر کی بنی ہوئی مورتوں کے لیے تو ان کے اندر یہ غیرت و حمیت ہے کہ جہاں کہیں ہمارے رسول کو دیکھ پاتے ہیں جھاڑ کے کانٹوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن معبود حقیقی — خدائے رحمان — کے معاملہ میں ان کی حس اس طرح مردہ ہو چکی ہے کہ اس کے لیے غیرت و حمیت تو درکنار اس کے ذکر کے بھی روادار نہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ کسی شرک میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دل ایسے اوندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنے شرکاء کے لیے تو ان کی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ ان کی حمیت و حمایت میں وہ ہر ایک سے لڑنے کے لیے آستین چڑھائے رہتے ہیں لیکن خدا کے معاملے میں وہ بالکل بے غیرت ہوتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی نعوذ باللہ خدا کو گالی بھی دے تو بھی ان کے اندر کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی! اس کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے جس کی طرف قرآن مجید نے بعض جگہ اشارہ کیا ہے۔ کسی موزوں مقام پر اس کی وضاحت آئے گی۔

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ۝ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (۳۷ - ۳۸)

عذاب کے لیے جلد بازی کا جواب

'انسان' سے مراد یہاں یہی مذاق اڑانے والے ہی لوگ ہیں۔ ایسے ناشائستہ لوگوں کا ذکر عام لفظ سے کر دیا ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کا تھتک کرنے کے لیے یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو آخر وہ کہاں اٹکا ہوا ہے! اگر سچے ہو تو اس کو لا کر دکھا کیوں نہیں دیتے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جائے۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ تاخیر تو خدا کی عنایت سے ہو رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں وہ فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں لیکن انسان بڑا ہی جلد باز پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس فرصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ان کو خطاب کر کے تہدید کے انداز میں فرمایا کہ اگر عذاب کے طلبگار ہو تو جلدی نہ مچاؤ، میں بہت جلد اپنے عذاب کی نشانیاں تم کو دکھاؤں گا جس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ پیغمبر جس چیز سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ دنیا میں بھی تمھارے سامنے آ کے رہے گی اور آخرت میں بھی تم اس سے دوچار ہو گے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۳۹)

یہ باندازِ حسرت فرمایا کہ آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، کاش یہ اس وقت کا بھی کچھ اندازہ کر پاتے جب خدا کے عذاب کی آگ ان کو آگے پیچھے ہر طرف سے گھیر لے گی اور ان کی بے کسی کا یہ حال ہوگا کہ نہ یہ اپنے آگے سے اس کو دفع کر سکیں گے، نہ پیچھے سے اور نہ ان کے ان حمایتوں کی طرف سے ان کی کوئی مدد ہو سکے گی جن کی جمعیت پر ان کو ناز ہے اور نہ ان معبودوں ہی سے ان کو کچھ سہارا مل سکے گا جن کے بل پر وہ خدا سے اکڑ رہے ہیں!

بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (۴۰)

فرمایا کہ وہ جب آئے گی تو وقت بتا کر نہیں آئے گی۔ اس کا صحیح وقت نہ کسی کو معلوم ہے نہ معلوم ہو سکتا ہے اس وجہ سے یہ نہ پوچھو کہ وہ کب آئے گی! وہ، جب اس کا وقت آجائے گا، اچانک آدھمکے گی۔ اس وقت نہ اس کا امکان ہوگا کہ وہ اس کو دفع کر سکیں اور نہ ان کو اس کے بعد کوئی مہلت ہی دی جائے گی کہ وہ ذرا دم لے لیں یا توبہ و اصلاح کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۱)

آنحضرت صلعم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے تاریخ کا حوالہ ہے کہ تم سے پہلے اللہ کے جو رسول گزرے ہیں ان کے انذار کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا جس طرح تمھارے انذار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس عذاب کا مذاق اڑایا گیا اس نے ان لوگوں کو آگھیرا جنھوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ مطلب یہ ہے کہ وہی روزِ بد تمھارے ان مذاق اڑانے والوں کے سامنے بھی آنے والا ہے۔

'سَخِرُوا مِنْهُمْ' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان قوموں پر جو فیصلہ کن عذاب آتا ہے اس میں صرف وہی لوگ ہلاک ہوتے ہیں جو اپنی تکذیب پر اڑے رہ جاتے ہیں اس سنتِ الٰہی کی طرف ہم دوسرے مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمَٰنِ ۗ بَلْ هُمْ عَن ذِكْرِ رَبِّهِم مُّعْرِضُونَ (۴۲)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں سے ایک سوال

فرمایا کہ عذاب کے لیے جو لوگ اتنی جلدی مچائے ہوئے ہیں ان سے پوچھو کہ اس سے بچنے کے لیے انھوں نے کیا بندوبست کر رکھا ہے! آخر رات اور دن خدائے رحمان کی پکڑ سے بچانے کے لیے ان کی کون حفاظت کر رہا ہے؟ خدا کا عذاب رات میں آجائے یا دن میں، کوئی اس کو روکنے والا نہیں بن سکتا تو اس طنطنہ کے ساتھ جو یہ اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کے مقابلہ کے لیے ان کے پاس کون سا لشکر ہے!

بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ: یہ ان کی اس بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ان کے اس سارے طنطنہ کی عمارت ریت پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لیے انھوں نے کوئی انتظام کر رکھا ہے، جس کے بل پر اکڑ رہے ہوں بلکہ انجام سے بے پروا ہو کر خدا کی یاد دہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ۭ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (۴۳)

یعنی کیا ان کی سرپرستی اور حفاظت کرنے کے لیے ہمارے سوا ان کے کچھ معبود ہیں جو ہماری پکڑ سے ان کو بچا لیں گے؟ اگر یہ اس طمع خام میں مبتلا ہیں تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ان کی مدد تو بھلا کیا کریں گے خدا کے مقابل میں وہ خود اپنی بھی مدد نہ کر سکیں گے اور نہ کسی دوسرے ہی کی مدد و رفاقت ان کو حاصل ہو سکے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کے خود تراشیدہ اصنام کی اول تو کوئی حقیقت تھی ہی نہیں، اگر بالفرض کسی کا کوئی وجود تھا تو اس کی بابت فرمایا کہ وہ خدا سے خود اپنے کو نہ بچا پائیں گے تو دوسروں کو بھلا کیا بچا سکیں گے!

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَاۗءِ وَاٰبَاۗءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۴۴)

اصل سبب استکبار و اعراض

یہ ان کے اصل سبب استکبار و اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ ایک طویل مدت تک خدا کی نعمتوں سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے دل سخت و سیاہ ہو چکے ہیں۔ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عزت و اقتدار جو ان کو حاصل ہے ان کے آباؤ اجداد کا ورثہ ہے، یہ اس کے موروثی حق دار ہیں، اسی میں وہ پیدا ہوئے ہیں، اسی میں عیش کریں گے اور اسی کے وارث ان کے اخلاف ہوں گے۔ اس زعم باطل نے پیغمبر کے انذار سے ان کو بالکل بے پروا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کی ساری تنبیہات محض ہوائی ہیں۔ ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

ایک طویل مدت تک خدا کی نعمت سے بہرہ مند رہنے کا نتیجہ ناشکروں پر قساوت قلب ہی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ سورۂ حدید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	اور ان لوگوں کی طرح بن کر نہ رہ جائیں جن کو اس سے
مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ	پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک طویل مدت گزر گئی
فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (۱۶)	اور ان کے دل سخت ہو گئے۔

غلبۂ اسلام کے آثار کی طرف اشارہ

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا: 'الارض' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔ سورۂ حج میں جہاں مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ سرزمین حرم کو کفار کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کریں وہاں فرمایا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۴۱) (ہم ان لوگوں کی مدد کریں گے جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم نے ان کو سرزمین حرم میں متمکن کیا تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے، منکر سے روکیں گے اور عاقبت کار کی کامیابی

اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'الارض' سرزمین حرم ہی کے لیے آیا ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ رعد آیت ۴۱ میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں ہم وضاحت سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

آیت زیر بحث میں ان آثار کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اس دور میں غلبۂ اسلام کے لیے نمایاں ہو چکے تھے۔ مکہ میں حق و باطل کی جو کشمکش برپا تھی اس میں مکہ کے حد تک تو حق ابھی مظلوم تھا لیکن اطراف کے قبائل اور خاص طور پر مدینہ میں اسلام کی دعوت جڑ پکڑ رہی تھی جس سے بالتدریج یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ کفر کا حیطۂ اقتدار کم ہو رہا ہے اور اسلام مکہ کے اطراف سے مکہ کو زیر نگیں کرنے کے لیے اس کو آہستہ آہستہ اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ اسلام کے اسی تدریجی غلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم اطرافِ مکہ سے ان لوگوں کے تسلط کو بالتدریج کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں! اَفَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ' یعنی یہ قرائن اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس کشمکش کے نتیجہ میں یہ غالب رہیں گے یا اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام اور اس کے علمبردار غالب رہیں گے! اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو یہ لوگ ان آثار کو کیوں نہیں دیکھتے جو ان کے اپنے اطراف میں نمایاں ہو رہے ہیں!

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ○ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۴۵-۴۶)

فرمایا کہ جو لوگ تم سے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ میں تو تم کو کسی اس طرح کی نشانی کے بجائے صرف وحی کے ذریعہ سے متنبہ کر رہا ہوں تاکہ تم کسی آفت میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر خدا کے غضب سے بچنے کی فکر کرو۔ یہ چیز تمہارے لیے نافع اور شکر کی سزاوار تھی لیکن تم اس کی قدر کرنے کے بجائے اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہو!

'وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی ہے۔ یہ عقل و دل کے بہرے ہیں اور جو بہرے ہوتے ہیں وہ جب کسی خطرے سے آگاہ کیے جاتے ہیں تو داعی کی پکار کو نہیں سنا کرتے یہاں تک کہ وہ اس کھڈ میں گر کے رہتے ہیں جس سے انھیں آگاہ کیا جاتا ہے۔

'وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ' الایۃ یعنی آج تو یہ اس ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا وہ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے جملہ اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں لیکن ان کی یہ ساری شیخی صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ نمودار نہیں ہوتا۔ اگر قہر الٰہی کا کوئی ادنیٰ جھونکا بھی کسی طرف سے آگیا تو یہ ساری شیخی ہرن ہو جائے گی، پھر یہ سر پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی! ہم خود اپنی جانوں پر آفت ڈھانے والے بنے کہ ہم نے رسول کی وحی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ 'نَفْحَةٌ' کی تنکیر یہاں اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ خدا کا عذاب تو بڑی چیز ہے اگر اس کا کوئی معمولی جھونکا بھی ان کو چھو گیا تو ان کے سارے

کس بل نکال دے گا!

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۴۷)

قیامت ظہورِ عدل کے لیے ہے

'اَلْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ' میں 'ل' کو مفسرین نے 'فی' کے معنی میں لیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ غایت و مقصد کے مفہوم میں ہے۔ یعنی مقصدِ قیامت کے ظہور کے لیے ہم عدل کی میزان نصب کریں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ یہ خدا کے عدل و انصاف کے ظہور کے لیے لازمی ہے۔

'وَاِنْ كَانَ' میں 'كَانَ' کا اسم بر بنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'اَتَيْنَا بِهَا' میں ضمیر مؤنث 'حَبَّةٍ' کی مناسبت سے ہے۔

فرمایا کہ مقصدِ قیامت یعنی جزا و سزا کو بروئے کار لانے کے لیے ہم عدل کی میزانیں نصب کریں گے تو اس دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ ہر جان ٹھیک ٹھیک کانٹے کی تول اپنے اعمال کا بدلہ پائے گی۔ رائی کے دانہ کے برابر بھی اگر کسی کا کوئی عمل ہوگا تو ہم اس کو بھی اس کے سامنے حاضر کر دیں گے۔

'وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ' ہم حساب کے لیے کافی ہیں۔ یعنی اس کام میں ہمیں کسی کی مدد و معاونت کی ضرورت نہیں ہوگی، ہم تنہا اس کو سرانجام دیں گے۔ اگر کسی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ساری خدائی کا یہ حساب کتاب ہم کس طرح کر سکیں گے تو یہ اس کا مغالطہ ہے اور اگر کوئی اس وہم میں مبتلا ہے کہ خدا کسی کے باب میں اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء سے کچھ معلومات حاصل کرنے کا محتاج ہوگا تو یہ بھی محض ایک واہمہ ہے۔

سورۂ لقمان میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶)

اے میرے بیٹے کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں خدا اس کو موجود کر دے گا۔ بے شک خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑی ہی خبر رکھنے والا ہے۔

۸- آگے کا مضمون ___ آیات ۴۸-۷۷

اوپر آیت ۲۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فرمایا کہ 'هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ' یعنی یہی تعلیم جو میں تمھیں دے رہا ہوں تمام انبیائے سابقین نے دی۔ اب ایک صوری ترتیب کے ساتھ ان انبیائے عظام کا حوالہ دیا جو امتوں کے بانی ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اوپر صاحب شریعت نبی و رسول حضرت موسیٰ ہوئے ہیں۔[1]

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام جہاں تک شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰ ہی کی شریعت کے پیرو تھے۔

چنانچہ پہلے ان کا ذکر فرمایا اور انہی کے ضمن میں حضرت ہارونؑ کا بھی ذکر فرمایا جو ان کے وزیر تھے - پھر ان سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو امتوں کے بانی اور نبوت کے دونوں سلسلوں ـــ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل ـــ کے امام تھے اور انہی کے ضمن میں حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت لوطؑ کا حوالہ دیا۔ پھر ان کے اوپر حضرت نوحؑ کا حوالہ دیا جن کو آدمِ ثانی ہونے کی حیثیت حاصل ہے - ان انبیائے عظام کا حوالہ گویا پورے سلسلہ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے اور مقصود ان کے حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جو دعوت ان انبیاء نے دی وہی دعوت اب تم کو دی جا رہی ہے جن خصوصیات کے حامل یہ انبیاء تھے وہی خصوصیات، تمہارے پیغمبر کے اندر بھی ہیں اور ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی فرما دی گئی کہ جو انجام ان نبیوں کے جھٹلانے والوں کا ہوا وہی انجام لازماً تمہارا بھی ہوگا اگر تم ان کی تکذیب پر اڑے رہ گئے - اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۸-۷۷ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۴۸﴾
الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَهُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ ﴿۴۹﴾ وَ
هَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ ۚ أَفَأَنتُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا ع ۴
إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ﴿۵۱﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَ
قَوْمِهِ مَا هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۲﴾ قَالُوا وَجَدْنَا
آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ
مُّبِينٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَل
رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكُم
مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا
مُدْبِرِينَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ﴿۵۸﴾
قَالُوا مَن فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۵۹﴾ قَالُوا سَمِعْنَا
فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوا فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا
يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾
ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ
اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ
لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا
حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾ قُلْنَا يٰنَارُ
كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ
الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا
لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۗ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۗ وَكُلًّا جَعَلْنَا
صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ
فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا
عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ
الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۗ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾
وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۗ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى ع ٤٥ ٥
مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾
وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۗ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾

ترجمۂ آیات ۴۸-۷۷

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی اور روشنی اور یاد دہانی عطا فرمائی، خدا ترسوں کے لیے۔ ان کے لیے جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور وہ قیامت سے لرزاں و ترساں رہنے والے ہیں۔ ۴۸-۴۹

اور یہ بھی ایک بابرکت یاد دہانی ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے تو کیا تم اس کے منکر ہی بنے رہو گے! ۵۰

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہدایت عطا فرمائی اور ہم اس سے خوب باخبر تھے۔ جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم دھرنا دیے بیٹھے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انہی کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔ اس نے کہا تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا رہے ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ جو کچھ تم ہمارے سامنے پیش کر رہے ہو سنجیدہ بات پیش کر رہے ہو یا ہنسی مسخری کر رہے ہو! اس نے کہا بلکہ تمھارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور میں اس پر تمھارے سامنے گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ اور خدا کی قسم! جب تم یہاں سے رخصت ہو کر لوٹ گے تو میں تمھارے ان بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔ پس اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا بجز ان کے ایک بڑے کے تاکہ وہ اسی کی طرف رجوع کریں۔ ۵۱-۵۸

وہ بولے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی! بے شک وہ بڑا ہی ظالم ہے! لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے حاضر کرو تاکہ وہ بھی گواہ رہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ ابراہیم! کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے! اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ

حرکت کی ہے تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں - تو ان کو ذرا تنبہ ہوا اور آپس میں بولے کہ بلاشبہ تم ہی ناحق پر ہو - پھر اوندھے ہو گئے، بولے کہ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں - اس نے کہا کیا خدا کے ماسوا تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی ضرر! تُف ہے تم پر بھی اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! کیا تم لوگ سمجھتے نہیں! ۵۹-۶۷

انھوں نے کہا کہ اس کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھو، اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہے! ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا اور انھوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی تو ہم نے انھیں ناکام بنایا - ۶۸-۷۰

اور ہم نے اس کو اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی تھیں - اور ہم نے اس کو اسحاق اور مزید برآں یعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو نیک بخت بنایا - اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہماری ہدایت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے ان کو بھلائی کے کام، نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ہدایت کی - اور وہ ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے - ۷۱-۷۳

اور لوط کو بھی ہم نے قوتِ فیصلہ اور علم کی نعمت عطا فرمائی - اور اس کو اس بستی سے نجات دی جس کے باشندے بدکاریوں کے مرتکب تھے - وہ لوگ بڑے ہی نابکار و ناہنجار تھے - اور ہم نے اس کو خاص اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکوکاروں میں سے تھا - ۷۴-۷۵

اور نوحؑ کو بھی ہم نے اپنی ہدایت بخشی - یاد کرو جب کہ اس نے دعا کی اس سے پہلے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی پس اس کو اور اس کے لوگوں کو عظیم کلفت سے نجات دی اور اس کی مدد میں ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا - بے شک وہ نہایت

ہی برے لوگ تھے تو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ ۷۶-۷۷

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۴۸-۴۹)

'فُرْقَان'، 'ضیاءٌ' اور 'ذِکْر' کا مفہوم

'فُرْقَان' حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کسوٹی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کتابِ الٰہی کی حیثیت اسی کو حاصل رہی ہے اور کتابِ الٰہی ہی وہ چیز ہے جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے معیار کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن کو بھی فرقان کہا گیا ہے۔ 'ضِیَاء' کے معنی روشنی کے ہیں۔ کتابِ الٰہی کے لیے 'ضیاء'، 'نور' وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ یہ تمام ذہنی و اخلاقی اور فکری و عملی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت و معرفت کی شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ 'ذکر' کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ یہ لفظ بھی جس طرح قرآن کے لیے جابجا استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ان صحیفوں میں چونکہ آفاق، انفس اور تاریخ کے حقائق کی یاددہانی کی گئی ہے اس وجہ سے ان کو 'ذکر' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

فرمایا کہ ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اور روشنی و یاددہانی عطا فرمائی لیکن وہ کتاب نافع صرف ان خدا ترسوں کے لیے ہوئی جو ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے بجائے غیب میں رہتے خدا اور آخرت سے ڈرنے والے تھے۔ مطلب یہ کہ اسی طرح یہ کتاب بھی کارگر صرف انہی پر ہوگی جن کی عقل و فطرت کا نور بجھا نہیں ہے بلکہ وہ خدا اور آخرت کا اپنے دلوں کے اندر خوف رکھتے ہیں۔ یہ مضمون سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کے تحت تفصیل سے زیر بحث آ چکا ہے اس وجہ سے یہاں ہم اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ۭ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۵۰)

یعنی جس طرح موسیٰؑ کو تورات عطا فرمائی تھی اسی طرح یہ مبارک کتاب بھی ہم نے اتاری ہے۔ اگرچہ یہ بارانِ رحمت کی طرح یکسر خیر و برکت ہے لیکن اس سے فیض صرف انہی کو پہنچے گا جن کے اندر صلاحیت ہے۔ 'اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ' یہ قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم اس نعمت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہو! مطلب یہ کہ اگر اس نعمت کا انکار کر رہے ہو تو سوچ لو کہ کس چیز کا انکار کر رہے ہو!

حضرت موسیٰؑ کا ذکر پچھلی سورہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے اس وجہ سے یہاں صرف سرسری اشارہ کر کے آگے حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ فرمایا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (۵۱)

رشد و ہدایت میں حضرت ابراہیمؑ کا مرتبۂ خاص

'رُشْد' سے مراد ہدایت و معرفت ہے اور اس کی اضافت نے اس کے اندر ایک خاص امتیاز کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی ابراہیم کو ہم نے وہ ہدایت و معرفت عطا فرمائی جو اس کے درجے اور مرتبے کے شایانِ شان تھی۔ ہدایت و معرفت کے مختلف مدارج ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو بھی اس میں سے کوئی حصہ عطا فرماتا ہے۔ وہ اس کی صلاحیتوں کو جانچ کر اس کے درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اس میں سے جو حصہ وافر ملا اس کی وضاحت ہم آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ الآیۃ کے تحت کر چکے ہیں۔ ان کے اسی وصفِ خاص کی طرف یہاں اشارہ فرمایا ہے۔

'وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ' یعنی یہ مرتبۂ بلند جو ہم نے اس کو بخشا تو یوں ہی نہیں بخش دیا بلکہ نہایت کڑے امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح پرکھ لیا کہ وہ اس مرتبہ کا سزاوار ہے۔ اس فقرے میں ان لوگوں پر تعریض بھی ہے جو اپنے اندر ہمت تو حضرت ابراہیمؑ کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ سنت پر عمل کرنے کی بھی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ نسبت کے دعویدار اور اس نسبت کے بل پر اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں بڑے سے بڑے مرتبہ کا حق دار سمجھے بیٹھے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے ہاں اس غلط بخشی کی گنجائش نہیں ہے وہ جس کو اپنی معرفت و حکمت بخشتا ہے اس کے ظرف اور اس کے حوصلہ کو دیکھ کر بخشتا ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۵۲)

قوم سے اصنام کے بارے میں بحث

اب یہ ان کی بالکل ابتدائی سرگزشتِ حیات کا ایک واقعہ بیان ہو رہا ہے جس سے ان کی جرأت و فتوت بھی واضح ہو رہی ہے اور وہ ہدایت و معرفت بھی جو اللہ تعالیٰ نے عین عنفوانِ شباب میں ان کو بخشی۔ ان کی ولادت اگرچہ ایک بت پرست قوم، ایک مبتلائے شرک خاندان اور ایک مشرک اور بت گر باپ کے گھر میں ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کا وہ نور عطا فرمایا جس کی روشنی سے دنیا آج تک منور ہے اور قیامت تک منور رہے گی۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں کو دعوت دی کہ یہ مورتیں کیا ہیں جن پر تم لوگ دھرنا دیے بیٹھے ہو! اس فقرے میں ان بتوں کے لیے جو استخفاف و تحقیر ہے اور لفظ 'عٰكِفُوْنَ' میں باپ اور قوم کی بلادت اور ان کے جمود پر جو طنز ہے وہ عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس عمر میں اور ایسے ماحول کے اندر یہ نعرۂ حق وہی بلند کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ توفیقِ خاص سے نوازے اور جس کے ایمان کی سطوت و جلالت ہر خوف اور ہر طمع سے بالکل بے پروا و بے نیاز ہو۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۵۳-۵۴)

باپ دادا کا طریقہ بجائے خود دلیل نہیں ہے

اس قسم کی حماقتوں کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہمیشہ ان کے حامیوں کی طرف سے یہی پیش کی گئی ہے کہ ان کا چلن باپ دادا سے چلا آ رہا ہے۔ یہی دلیل حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے لوگوں نے پیش کی کہ ان بتوں کی عبادت تو ہمارے باپ دادا نے کی ہے تو ہم ان کو کس طرح چھوڑ بیٹھیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل احمقانہ ہے

لیکن عام لوگوں کے لیے یہ بہت ہی مرعوب کن ہوتی ہے۔ باپ دادا کے طریقہ کے لیے دلوں میں ایک حمیت و عصبیت جڑ پکڑ جاتی ہے جس کے سبب سے اس کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا یا اس کی دعوت دینا بڑے جان جوکھم کا کام بن جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جو نور معرفت عطا فرمایا تھا اس کو ان پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے جواب میں پوری عزیمت و بے خوفی کے ساتھ فرمایا کہ تم اور تمھارے باپ دادا سب کھلی ہوئی گمراہی میں رہے اور ہو۔ کوئی ضلالت مجرد اس دلیل سے ہدایت نہیں بن جائے گی کہ وہ باپ دادا کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ بلکہ اس کو عقل و فطرت کی کسوٹی پر جانچنا پرکھنا بھی ضروری ہے!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِیْنَ ۝ قَالَ بَلْ رَّبُّکُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّتِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ (۵۵-۵۶)

دعوتِ حق کی راہ میں ایک اہم قدم

'حق' سے یہاں سنجیدہ اور سوچی سمجھی ہوئی بات مراد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات ان کی قوم کے لوگوں کے لیے اتنی انوکھی اور عجیب تھی کہ وہ یہ باور نہ کر سکے کہ کوئی شخص سوچ سمجھ کر ایسی بات زبان سے نکال سکتا ہے۔ انھوں نے گمان کیا کہ یہ الھڑ نوجوان، جوانی کی ترنگ میں، بے سوچے سمجھے، بس یونہی ایک بات کہہ گزرا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سوال کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہو واقعی اپنا عقیدہ بیان کر رہے ہو یا محض مذاق کر رہے ہو! انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے اس نعرۂ حق کو ایک غیر سنجیدہ اور لا ابالیانہ نعرہ قرار دے کر لوگوں کو اس کے اثر سے بچانا چاہا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ان کے جواب میں دعوتِ حق کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ یہ پتھر اور مٹی کے بت تمھارے رب نہیں ہیں بلکہ تمھارا رب آسمانوں اور زمین کا وہ خداوند ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں تمھیں اسی کی دعوت دیتا اور تمھارے اندر اسی کی منادی کرتا ہوں۔ شہادت یہاں دعوت اور اعلان کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

وَتَاللّٰهِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ (۵۷)

حضرت ابراہیمؑ کا خاص طرزِ استدلال

حضرت ابراہیمؑ نے لگے ہاتھوں، لفظیہ قسم، لوگوں کو اپنے اس ارادہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ جب آپ لوگ یہاں سے ہٹو گے تو میں ان بتوں کے ساتھ ایک خفیہ کارروائی کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ لفظ 'کید' پر ہم مختلف مقامات میں بحث کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسے اقدام کے لیے بھی آتا ہے جو کسی مخالف کے خلاف اس طرح کیا جائے کہ وہ اس سے باخبر نہ ہو سکے۔

'تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعوت بت خانہ کے اندر کسی اجتماع کے موقع پر دی ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ جب آپ لوگ یہاں سے گھروں کو سدھاریں گے تو میں آپ کے ان خداؤں کی مرمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اصل اسکیم کو حضرت ابراہیمؑ نے مخفی رکھا۔ یہ جس صورت میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو پڑھنے سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے مخصوص طریقۂ بحث و استدلال کے ان پہلوؤں پر ایک نظر ڈال لیجیے جن کی وضاحت سورۂ انعام کی آیات ۷۶-۷۹ کے تحت بعنوان 'حضرت ابراہیمؑ

کے طرزِ استدلال کی بعض خصوصیات، ہم کر آئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بحث و استدلال میں لطیف و پاکیزہ طنز سے جس طرح کام لیتے ہیں اسی طرح استدراج بھی حجتِ ابراہیمی کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ بحث میں اپنے حریف کو وہاں سے داؤں پر لاتے ہیں جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ چاروں شانے چت گرتا ہے اور اسے خود اپنی زبان سے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی طریقۂ استدراج حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حریفوں کو قائل کرنے کے لیے اس موقع پر استعمال فرمایا۔ انھوں نے شب میں کوئی موقع نکال کر تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا اور ذہن میں یہ رکھا کہ اگر نوبت مجھ سے بازپرس کی آئی تو میں کہہ دوں گا کہ یہ حرکت تو ان بڑے صاحب کی معلوم ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھنے کے بجائے خود ان مظلوموں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے، اگر وہ بولتے ہیں تو اپنی داستانِ غم خود ہی سنا دیں گے کہ یہ مصیبت ان پر کس کی لائی ہوئی ہے! ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً یہی کہیں گے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح پوچھا جائے تو میں ان سے کہوں گا کہ نادانو! جو خود اپنے اوپر آئی ہوئی مصیبت کو نہ دفع کر سکتے ہیں نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ مصیبت کس کے ہاتھوں ان پر آئی آخر وہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کو معبود بنا کر ان کو ڈنڈوت کرتے ہو! یہی وہ ذہنی اسکیم ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ نے کید سے تعبیر فرمایا۔ اس میں طنز، تضحیک اور استدراج کے جو پہلو ہیں وہ واضح ہیں اور حریفوں کو جس طرح بے بس ہو کر اس حجتِ ابراہیمی کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ (۵۸)

بت شکنی کی سکیم پر عمل

'جُذٰذ' پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اس مخفی تدبیر کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ارادے کو بروئے کار لانے کے لیے اختیار فرمائی۔ انھوں نے موقع نکال کر بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ بڑے بت کو اس خیال سے چھوڑ دیا کہ جب اس معاملہ کی تفتیش ہو تو وہ ان احمق لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ یہ تو اس بڑے کی کارستانی معلوم ہوتی ہے تو اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اور اگر یہ کہیں کہ یہ تو بولتے نہیں تو پھر ان پر اتمامِ حجت کا موقع ہاتھ آئے کہ جب یہ بڑے چھوٹے سب ہی گونگے ہیں تو آخر ان گونگوں بہروں کو معبود بنانے کے کیا معنی؟

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۹)

یہ دو الگ الگ مستقل جملے ہیں۔ پہلے جملہ سے ان کی حیرت و پریشانی کا اظہار ہو رہا ہے، دوسرے سے ان کے غصہ و غضب کا۔ یعنی جب انھوں نے اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا تو پہلے تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جسارت کی؟ پھر اپنے غصہ و غضب کا اظہار کیا کہ جس نے بھی یہ حرکت کی وہ بڑا ہی ظالم ہے!

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ (۶۰)

بالآخر جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے رجحانات اور ان کی مذکورہ بالا دعوت اور ان کے چیلنج سے آگاہ تھے انھوں نے بتایا کہ یہ اسی نوجوان کی حرکت ہو سکتی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں، ہم نے اس کو ان بتوں کا ذکر تحقیر کے ساتھ کرتے سنا ہے۔ 'تحقیر' کے الفاظ انھوں نے بھی اسی طرح حذف کر دیے جس طرح آیت ۳۶ میں یہ حذف ہیں۔ اس حذف کی بلاغت ہم وہاں واضح کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی شان میں گویا نقل کفر کو بھی گوارا نہیں کیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کے ساتھ جو معاملہ کرنے کی دھمکی دی تھی وہ بقید قسم ڈنکے کی چوٹ دی تھی۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ان کی دعوتِ توحید بھی بالکل برملا اور آشکارا تھی۔ بہت سے لوگ ان کی ان باتوں سے واقف تھے لیکن اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ کی ان باتوں کو جو لوگ سنتے تھے وہ ان کو، جیسا کہ اوپر گزرا ہے، ان کی نوجوانی کی ترنگ اور جسارت پر محمول کر کے ٹال جاتے تھے۔ ان کو یہ گمان نہیں تھا کہ فی الواقع حضرت ابراہیمؑ کوئی اس طرح کا اقدام کر گزریں گے جیسا کہ اب ان کے سامنے آیا، اس وجہ سے انھوں نے ان کے اوپر نہ کوئی قدغن عاید کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ بتوں کی حفاظت کے لیے کوئی اہتمام کیا۔ ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ کوئی ہمارے ان معبودوں سے کتنا ہی برگشتہ ہو لیکن ان کے خلاف کوئی خطرناک اقدام کرنے کی جسارت بھلا کیا کر سکے گا! لیکن جب یہ حادثہ پیش آیا تو جو لوگ حضرت ابراہیمؑ سے واقف تھے انھوں نے بتایا کہ ہو نہ ہو یہ کارروائی اسی نوجوان کی ہے جس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ اس کو ہم نے ان معبودوں کی ہجو کرتے سنا ہے۔

'یُقَالُ لَہٗٓ اِبْرٰھِیْمُ' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت بہت سے کانوں میں پڑ چکی تھی لیکن ابھی وہ قوم میں اتنے روشناس نہیں ہوئے تھے کہ لوگ شخصاً ان سے واقف ہوں تاہم ان کا نام مختلف حلقوں میں پہنچ چکا تھا اور وہ دینِ آبائی کے ایک باغی نوجوان کی حیثیت سے معروف ہو رہے تھے۔ اسی بنا پر ان گواہی دینے والوں نے ایک حقارت آمیز انداز میں یوں کہا کہ وہی سرپھرا نوجوان جس کو ابراہیمؑ، ابراہیمؑ پکارتے ہیں، ہمارے ان معبودوں کی ہجو کرتا رہا ہے، ہو نہ ہو، یہ اسی کی کارستانی ہے!

قَالُوْا فَاْتُوْا بِہٖ عَلٰٓی اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَشْھَدُوْنَ (۶۱)

حضرت ابراہیمؑ پر مقدمہ

حضرت ابراہیمؑ پر الزام قائم ہو جانے کے بعد قوم کے سربراہوں نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو عام لوگوں کے سامنے لا کر پبلک کی موجودگی میں ان سے پوچھ گچھ کی جائے کہ سارا معاملہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگ اس کے گواہ رہیں۔ یہ اہتمام اس لیے ضروری خیال کیا گیا ہو گا کہ یہ جرم ان کے نزدیک ایک سنگین جرم تھا جس کی سزا بھی ان کی شریعت میں بہت سخت تھی اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اس کی تحقیقات پبلک کے سامنے ہو تاکہ لوگوں کو جرم کی شناعت کا اندازہ بھی ہو اور مجرم کو جو سزا دی جائے وہ عام عبرت کی موجب بھی ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں اس طرح کے مذہبی معاملات میں حکم لگانے اور فتویٰ دینے کے مجاز مذہبی پیشوا ہوتے تھے۔ حکومتِ وقت (اگر کوئی ہوتی تھی) انہی کے فتوے کی تنفیذ کر دیتی تھی۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۶۲-۶۳)

حضرت ابراہیمؑ کا جواب

بالآخر مذکورہ بالا حکم کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام عام لوگوں کے سامنے، پیشوایانِ دین کی عدالت میں، پیش کیے گئے اور ان سے سوال ہوا کہ ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ جرم تم نے کیا ہے؟ حضرت ابراہیم نے نہایت تیکھے طنز اور استہزا کے انداز میں جواب دیا کہ یہ کارستانی تو ان کے اس بڑے کی معلوم ہوتی ہے اور اس بارے میں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، آخر آپ لوگ انہی سے کیوں نہیں پوچھتے، اگر یہ بولتے ہیں تو خود ہی اپنی کہانی آپ کو سنا دیں گے!

یہ جواب دے کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان بزرگوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اعترافِ شکست کے سوا کوئی اور راہ ان کے لیے باقی ہی نہیں رہ گئی۔ ان کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (یہ تو تمھیں اچھی طرح علم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں) ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی اگر یہ اس لائق بھی نہیں کہ خود اپنی بپتا تم کو سنا سکیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہو! تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر لعنت ہے۔ آخر تم لوگ عقل سے کیوں کام نہیں لیتے!

حضرت ابراہیمؑ پر خوف یا جھوٹ کی تہمت عربی سے بے خبری پر مبنی ہے

جن لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب، بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ، کو کذب یا خوف پر محمول کیا ہے وہ عربی سے بے خبری کے باعث اس ارشاد کی بلاغت کو نہ سمجھ سکے۔ خوف کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ جب وہ اس طرح بے دھڑک قوم کے بت خانے کے اندر توحید کی اذان دیتے ہیں، بتوں کے خلاف ایک مخفی اقدام کا اعلان کرتے ہیں اور پھر عین عدالت کے منہ پر ساری قوم کے سامنے اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ کے الفاظ سے بتوں پر بھی اور ان کے پوجنے والوں پر بھی لعنت کرتے ہیں تو ایسے مردِ حق کے بارے میں یہ گمان بالکل ہی خلاف عقل ہے کہ وہ کسی خطرے سے مرعوب ہو کر سخن سازی کرے گا۔

رہا اس کے جھوٹ ہونے کا معاملہ تو قطع نظر اس سے کہ حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بول سکتے ہیں یا نہیں کہی ہوئی بات میں کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ اس کو جھوٹ پر محمول کیا جا سکے۔ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ایک لطیف طنز، ایک پر معنی استہزاء اور ایک حکیمانہ استدراج کہہ سکتے ہیں، جھوٹ کا تو اس میں کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے حضرت ابراہیمؑ کے مخالفوں نے بھی ان پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا حالانکہ اگر وہ ان کے جواب کو جھوٹ سمجھتے تو وہ بڑی آسانی سے ان کو جھوٹا قرار دے سکتے تھے۔ پھر جب ان کے دشمنوں نے ان کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت نہیں کی تو نعوذ باللہ ہم ان کو جھوٹا کیوں قرار دیں!

بعض لوگوں کو ایک حدیث کی بنا پر مغالطہ ہوا تھا جس میں یہ آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے جن میں سے ایک ان کا یہ قول بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا بھی ہے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کے سمجھنے

میں لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ عربی میں لفظ 'کذب' کئی معنوں میں آتا ہے۔ اگر کہیں 'کَذَبَ فُلَانٌ' تو اس کے معنی جس طرح یہ ہو سکتے ہیں کہ اس نے جھوٹ بولا اسی طرح یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے غلطی کی اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے توریہ کیا۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین اس کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ توریہ کا مفہوم اپنے مخالف کے سامنے اپنی بات کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں پڑ جائے۔ اور ہم نے 'استدراج' کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ اس توریہ کی نہایت لطیف و پاکیزہ مثالیں قرآن میں بھی موجود ہیں اور سلف صالحین کے اقوال میں بھی۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں بعض عمدہ مثالیں گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا ایک لطیف و پاکیزہ توریہ 'اِنِّیْ سَقِیْمٌ' بھی ہے۔ اس کی بلاغت ان شاء اللہ سورۂ صافات کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں یہ دشمن کے مقابل میں راستبازوں کا ایک کارگر حربہ ہے۔ حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے کذب کے اس مفہوم کے ثبوت میں کلامِ عرب کے شواہد میں پیش کر سکتا ہوں لیکن بحث بالکل دوسرے گوشے میں نکل جائے گی اس وجہ سے اس کو کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

ابطالِ شرک کی ایک واضح دلیل

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سیدنا حضرت ابراہیمؑ کا قول 'بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا' بجائے خود ابطالِ شرک کی ایک نہایت واضح دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اگر اس کائنات میں مختلف چھوٹے بڑے خداؤں کی خدائی مان لی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدائے اعظم اپنی خدائی میں دوسروں کی شرکت تسلیم کرنے پر راضی ہو اور اگر بالفرض کسی وقتی مصلحت سے وہ راضی بھی ہو جائے تو یہ امر بعید نہیں ہے کہ کسی دن وہ برہم ہو کر سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ اسی حقیقت کو سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے اس فعل سے ممثل کر کے دکھا دیا اور ان کے حریف اس حقیقت کو، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا، پا بھی گئے اگرچہ وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ ایک نہایت اعلیٰ حکیمانہ استدراج و استدلال اور شرک و اہلِ شرک کی تفضیح و تضحیک ہے۔ اس کو جھوٹ پر محمول کرنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی نہیں ہے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۶۴)

ایک قدم صحیح دوسرا الٹا

یعنی حضرت ابراہیمؑ کی اس ٹھوکر نے ذرا ان کو متنبہ کیا اور وہ اپنے باطن کی آواز اور اپنے عقل و دل کی رہنمائی کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم لوگ تو اس نوجوان کو ظالم کہتے ہو لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ ظالم وہ نہیں بلکہ ظالم تم خود ہو کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو جو یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتی ہیں کہ خود اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو دفع کر سکیں یا اس کو کسی دوسرے سے بیان ہی کر سکیں۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (۶۵)

'نکس' کے معنی کسی چیز کو اس طرح الٹ دینے کے ہیں کہ اس کے پاؤں اوپر ہو جائیں اور اس کا سر نیچے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس تنبیہ سے ذرا دیر کے لیے انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سہی لیکن پھر اوندھے ہو

گئے اور بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں تو ہم ان سے کس طرح پوچھیں! — جو لوگ اس قسم کی جہالتوں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے دلوں پر بھی کبھی کسی واقعہ یا تنبیہ سے ایسی روشنی پڑتی ہے کہ انھیں سیدھی راہ صاف دکھائی دینے لگتی ہے لیکن عصبیتِ جاہلیت آسانی سے جان چھوڑنے والی چیز نہیں ہے اس وجہ سے وہ پھر اندھے بہرے بن جاتے ہیں اور ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر وہی الٹی چال اختیار کر لیتے ہیں جو چل رہے ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا بھرپور وار

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (۶۶)

حضرت ابراہیمؑ اپنے حریفوں کو جس مقام پر لانا چاہتے تھے ان کو انھوں نے وہاں لا کھڑا کیا۔ وہ پکار اٹھے کہ یہ تو بولتے نہیں تو ان سے کس طرح ان کا حال پوچھا جائے! ان کے اس اعتراف کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ان پر بھرپور وار کیا۔ فرمایا کہ پھر تم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہو جو نہ تم کو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی نقصان! یہ تقریر ظاہر ہے کہ بتوں کی بے بسی کو اس طرح آشکارا کر دینے کے بعد جتنی مؤثر ہو سکتی تھی اس کے بغیر اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بغیر اگر یہی بات ان کے سامنے لائی جاتی تو وہ اس کے جواب میں سو باتیں بنا سکتے تھے لیکن اب جب کہ وہ پاش پاش ہو کر سامنے پڑے ہوئے اپنی زبانِ حال سے اپنی بے حقیقتی اور بے بسی کی کہانی خود ہی سنا رہے تھے تو ان کے پجاری ان کی حمایت میں کیا چیز پیش کر سکتے تھے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶۷)

'اُفٍّ لَّكُمْ' نہایت شدید نفرت و کراہت کا کلمہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس طرح ان پر حجت تمام کر دی، پھر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں تو انھوں نے نہایت کراہت و بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، تف ہے! 'اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ' یعنی کیا تم بالکل لا یعقل بیل ہی ہو! بھلا ان پتھروں کی مورتوں کو پوجنے سے کیا حاصل! جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ وہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو آخر وہ تمھاری حفاظت کس طرح کریں گی!

مذہبی عدالت سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے حکمِ سزا

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (۶۸)

جب پجاریوں اور مندر کے پروہتوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کا سارا کاروبارِ پیشوائی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ نہ ان کا کوئی بھرم رہ گیا ہے نہ ان کے معبودوں کا تو اپنے عوام کو اکسایا کہ یہ وقت اپنے معبودوں کی حمایت میں اٹھنے کا ہے۔ اگر اس وقت اس نوجوان کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کی گئی تو آباؤ اجداد کا دین تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے اس اپیل کا عوام پر اثر ہوا اور حضرت ابراہیمؑ کے خلاف اقدام سے متعلق کچھ تجویزیں بھی سامنے آئیں لیکن ان تجویزوں سے پروہتوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے ابھارا کہ اگر اس شخص کے خلاف سچ مچ کوئی مؤثر کارروائی کرنی ہے تو یہ کرو کہ اس کو جلا دو۔ پروہتوں نے چاہا

کہ یہ سزا دے کر اپنے زعم کے مطابق اس فتنہ کا کلی سدباب کر دیں۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ (۶۹)

آگ حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی

اس فیصلہ کے بموجب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو آگ میں جلانے کی کوشش کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ اس کی کیا شکل ہوئی؟ قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ اشیاء کے خواص و اثرات تمام تر اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ جس زہر کو جس کے لیے چاہے تریاق بنا دے اور جس تریاق کو جس کے لیے چاہے زہر بنا دے۔ اس قسم کے عجائبِ تصرفاتِ قدرت ہم آج بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر خدا نے اپنے ایک پیغمبر کی حفاظت کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تو یہ کیا عجیب بات ہوئی!

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (۷۰)

پروہتوں کی سازش کی ناکامی اور حضرت ابراہیم کی ہجرت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کے لیے پروہتوں نے ایک سازش کی جس کی طرف سورۂ صافات کی آیت ۹۸ میں اشارہ ہے۔ انشاء اللہ ہم وہاں اس کی وضاحت کریں گے۔ پروہتوں کی یہ سازش ناکام ہوئی اور اس کے بعد حضرت ابراہیم نے اس علاقہ سے ہجرت فرمائی۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (۷۱)

'اَلْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ' سے زرخیز و شاداب علاقہ مراد ہے۔ یہ اشارہ ارضِ کنعان کی طرف ہے۔ یعنی جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ابراہیم کے لیے اپنے وطن میں ٹکنا ناممکن ہو گیا تو فرمایا کہ ہم نے اس کو اور لوط کو ان کی قوموں کے شر سے نجات دی اور کنعان کے علاقے میں ان کو ٹھکانا دیا۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ اگرچہ ان دونوں حضرات کا دائرۂ دعوت الگ الگ تھا لیکن اس ہجرت میں حضرت لوط بھی ان کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہجرت تک دونوں نے اپنی قوم ہی کو دعوت دی لیکن ہجرت کے بعد مختلف علاقوں کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم کی قوم سے کیا معاملہ ہوا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (۷۲-۷۳)

حضرت ابراہیم پر اللہ کا انعام

یہ اللہ تعالیٰ نے وہ انعام بیان فرمایا ہے جو ہجرت کے بعد اس نے حضرت ابراہیم پر یکے بعد دیگرے کیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور عزیزوں کو چھوڑا تھا تو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے بیٹے پوتے عطا فرمائے۔ انھوں نے جن کو چھوڑا تھا وہ نابکار و ناہنجار تھے اور اللہ نے ان کی جگہ ان کو جو دیے وہ سب ایک سے ایک بڑھ کر صالحین و اخیار میں سے تھے۔ 'نَافِلَةً' سے اس حقیقت کا اظہار

مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ تو ان کی دعا کے صلہ میں ملے مزید برآں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بھی عطا فرمائے اور اس کے بعد نبوت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔[1] وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّةً میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ امتوں کے بانی اور قوموں کے امام ہوئے۔ اگرچہ ہر نبی اپنے منصب کے لحاظ سے امام ہوتا ہے لیکن بعض انبیاء ایسے بھی گزرے ہیں جن کے سایہ کے سوا ان کا کسی نے ساتھ نہیں دیا مگر حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کو بالفعل اللہ تعالیٰ نے منصب امامت پر سرفراز فرمایا اور انھوں نے ایک عظیم امت کی قیادت فرمائی۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ۔ 'اِقَامَ الصَّلٰوةِ' دراصل اِقَامَةَ الصَّلٰوةِ ہے 'اِقَامَة' کی 'ۃ' آہنگ و صوت کے تقاضے سے گر گئی ہے۔ اس قسم کی تخفیف بتقاضائے حسنِ صوت عربی میں معروف ہے۔ ان انبیاء کی دعوت کے ان اجزا کے گنانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کی دعوت وہی رہی ہے جو قرآن دے رہا ہے اور یہ تمام انبیاء صرف خدا ہی کے عبادت گزار تھے، خدائے واحد کے سوا انھوں نے کسی اور کے آگے سر نہیں جھکایا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان نبیوں کے نام لیوا اور ان کے ساتھ نسبت کے مدعی ہیں وہ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں اور اپنے قول و عمل کا جائزہ لیں۔ وہ کیا تھے اور یہ کیا بن کے رہ گئے۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۷۴-۷۵)

حضرت لوطؑ پر حکم اور علم کا انعام — اوپر حضرت لوطؑ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے آیا تھا۔ اب یہ ان کا مستقل ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔ 'حکم' سے مراد فیصلہ کی قوت و صلاحیت ہے اور علم سے مراد علم نبوت ہے۔ پہلی چیز عقل و فطرت کی پاکیزگی کا ثمرہ ہے، دوسری چیز وحی الٰہی کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو منصب نبوت کے لیے انتخاب فرمایا وہ نخلِ فطرت کے بہترین ثمر تھے۔ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ ان کا باطن نورِ حکمت سے منور ہو کر نورِ وحی کے اخذ و اکتساب کے قابل ہو گیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نورِ وحی سے فیضیاب فرمایا تو وہ 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' ہو گئے۔

حضرت لوطؑ کی ہجرت — 'وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ'۔ ان کی نجات کی جو شکل ہوئی اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ انھوں نے بھی سرزمین شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ ان کی بستی کے لوگوں پر چونکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اس وجہ سے ان کے وہاں سے نکلنے کو نجات سے تعبیر فرمایا۔ 'كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ'

---

[1] سورۂ صافات کی آیات ۱۰۰-۱۱۲ کے تحت ان شاء اللہ یہ بحث آئے گی کہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ دعا کے صلہ میں ملے ہیں اور حضرت اسحاقؑ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے صلہ میں۔ اس تاریخی حقیقت کو یہود نے جس طرح مسخ کیا ہے اس کی تفصیل استاذ امامؒ کے رسالۂ ذبیح میں دیکھیے۔

سے اصلاً تو ان کی امرد پرستی کی خباثت کی طرف اشارہ ہے جس کو بعض جگہ 'فاحشة' سے تعبیر فرمایا ہے لیکن لفظ جمع اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس نوع کی کوئی برائی کبھی تنہا نہیں ہوتی بلکہ یہ جب کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے سایہ میں فواحش و خبائث کا ایک پورا کنبہ آباد ہو جاتا ہے۔ یہاں ان برائیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی اس لیے کہ اس قسم کی گھناؤنی برائیاں قابلِ ذکر نہیں ہوا کرتیں۔

قوم لوط کا انجام — 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو ان لوگوں کے اندر سے نکالا اور ان پر اپنا عذاب نازل کیا۔ فرمایا کہ یہ نابکار اور نافرمان لوگ تھے اور لوطؑ صالح اور خوب کار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندے کو ان ناہنجاروں کے اندر سے نکال لیا اور ان نابکاروں کو دفن کر دیا۔ 'وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا' میں 'رحمت' سے مراد وہ نجات و فلاح بھی ہے جو اس دنیا میں ان کو حاصل ہوئی اور وہ کامیابی و کامرانی بھی جو آخرت میں ان کو حاصل ہوگی۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ (۷۶)

حضرت نوحؑ کا حوالہ — 'نُوْحًا' کا نصب اس مفہوم سے پیدا ہوا ہے جو یہاں سلسلۂ کلام سے مستفاد ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے اپنے مذکورہ بالا بندوں پر اپنی رحمت نازل کی، ان کو نجات دی اور ان کی مدد فرمائی اسی طرح اس سے پہلے اپنے بندے نوحؑ کو بھی ہم نے نجات دی اور اس کی مدد فرمائی۔

حضرت نوحؑ کی آخری دعا — 'اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ' یہ حضرت نوحؑ کی اس آخری دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ نوح میں تفصیل سے مذکور ہے اور جس کو پڑھ کر دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس دعا کی قبولیت جس شکل میں ظاہر ہوئی اس کی تفصیل تو سورۂ نوح میں آئے گی۔ یہاں صرف اس سلسلہ کی آخری آیات کو یاد کر لیجیے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا	پس قوم نوحؑ کے لوگ اپنے جرموں کی پاداش میں
نَارًا ۥ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ	غرق کر دیے گئے، اور آگ میں داخل کیے گئے
دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۔ وَقَالَ	اور وہ خدا کے مقابل میں اپنے لیے کوئی مددگار
نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى	نہ پا سکے۔ اور نوحؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب!
الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۔	تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک کو بھی چلتا پھرتا
اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا	نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ تیرے
عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا	بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف ناہنجاروں اور
فَاجِرًا كَفَّارًا ۔ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ	ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب!
وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ	میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور ان کی
مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ	جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں۔
الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اور تمام مومنین و مومنات کی اور ظالموں کے لیے

إِلَّا تَبَارًا ٥ (نوح، ۲۵-۲۸) — صرف تباہی میں اضافہ کر۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ۔ لفظ 'اَھْل' کی تحقیق سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۳۲ کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سے کسی شخص کے اہلِ خانہ اور اتباع و اصحاب سب مراد ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے باایمان ساتھیوں کو ایک عظیم کلفت اور بہت بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔ 'کربِ عظیم' سے مراد وہ غم و الم بھی ہے جو اعدائے حق کی ستم رانیوں اور اذیتوں سے ایک مدتِ دراز تک ان کو اور ان کے مظلوم ساتھیوں کو لاحق رہا اور وہ عذابِ عظیم بھی ہے جس میں بالآخر ان کی پوری قوم مبتلا ہوئی۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۷۷)

قومِ نوحؑ کا انجام

'نَصَرْنَا' کے بعد 'مِنْ' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'اِنْتَقَمْنَا' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ عربیٔ زبان کے اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ 'ہم نے اس کی مدد کی اور ان لوگوں سے ہم نے انتقام لیا جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی'۔ ہم نے ترجمہ میں اس تضمین کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ 'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ' میں بالاجمال ان کے جرم کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نہایت ہی برے لوگ تھے۔ ان کے جرائم کی تفصیل پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور آگے سورۂ نوح میں بھی آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ جتنی طویل مدت تک حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو جھنجھوڑا ہے اس کی کوئی دوسری مثال شاید مشکل ہی سے مل سکے گی اور حضرت نوحؑ کی دلسوزی اور دردمندی کا جو حال رہا ہے اس کی تفصیل خود حضرت نوحؑ کی زبان سے انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی لیکن یہ ایسے پتھر لوگ تھے کہ کوئی چیز بھی ان پر کارگر نہ ہو سکی۔ 'فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ' ان لوگوں کی اس سنگ دلی اور ناشکری کی سزا ان کو بالآخر یہ ملی کہ پوری قوم کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ بلکہ یہ پوری قوم خدا کی زمین پر غلاظت کا ایک ڈھیر تھی جس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے سمندروں اور آسمان کے بادلوں کو حکم دیا کہ وہ اس ناپاکی کے ڈھیر سے خدا کی زمین کو دھو کر پاک کر دیں۔ چنانچہ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ طوفانِ نوح نے اس زمین کو دھو کر بالکل پاک کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے پاکیزہ صفات ساتھیوں سے اس کو ازسرِ نو آباد کیا۔ اس مضمون کو اچھی طرح کھولنے کے لیے تورات میں قومِ نوح سے متعلق جو کچھ آیا ہے اس کا حوالہ بہت مفید رہتا لیکن اس کے لیے موزوں جگہ انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

۱۰۔ آگے کا مضمون —— آیات ۷۸-۹۴

اوپر کی آیات میں، ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ، ان انبیائے عظام کا ذکر ہوا جو ملتوں اور امتوں کے بانی ہوئے، اب آگے ایک صفاتی ترتیب کے ساتھ ان انبیاءؑ کا ذکر آرہا ہے جو اپنی صفات اور اپنے کردار کے اعتبار سے پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت داؤد

اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر فرمایا جو بادشاہی اور درویشی کے امتزاج کی بہترین مثال تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے شوکتِ دنیا عطا فرمائی لیکن وہ اس کے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بجائے برابر خدا کے شکرگزار رہے اور اپنی تمام صلاحیتیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع انھوں نے اپنے رب ہی کی رضا جوئی میں صرف کیے۔ اس کے بعد حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر فرمایا جو اپنے صبر کے اعتبار سے تمام انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے امتحانوں میں ان کو ڈالا اور ہر امتحان میں یہ ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد حضرت یونس، حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہم السلام کا ذکر فرمایا جنھوں نے نہایت تاریک اور مایوس کن حالات کے اندر اپنے رب کو پکارا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کے لیے اپنی رحمتِ خاص سے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ ان انبیائے کرام کی زندگیوں میں ان متکبرین کے لیے بھی درس ہے جو خدا کی نعمتیں پاکر خدا ہی سے اکڑ رہے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مظلوم صحابہؓ کے لیے بھی درس ہے جو آزمائش کے ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے اور جن کو سامنے کی راہ بالکل زندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ آیات
وَکُنَّا لِحُکْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا ۷۸-۹۲
وَّعِلْمًا ۠ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ ؕ وَکُنَّا
فٰعِلِیْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْۢ بَاْسِکُمْ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ
بِاَمْرِهٖۤ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا ؕ وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ﴿۸۱﴾
وَمِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِکَ ۚ
وَکُنَّا لَهُمْ حٰفِظِیْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ
وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَکَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ
ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِکْرٰی
لِلْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْکِفْلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۸۵﴾

وَأَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۖ إِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَذَا النُّوْنِ إِذْ ذَّهَبَ
مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ
أَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ
نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾ وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى
رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ
وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۚ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَالَّتِيْٓ
أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾ إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾
وَتَقَطَّعُوْٓا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۚ كُلٌّ إِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ ع ٦
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَإِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾

ترجمۂ آیات ۷۸-۹۴

اور داؤد اور سلیمان پر بھی ہم نے اپنا فضل کیا۔ یاد کرو جب کہ وہ ایک کھیتی کے مقدمے
کا فیصلہ کر رہے تھے جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں شب میں جا پڑی تھیں اور ہم ان کے
اس قضیہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس کو سمجھا دیا سلیمان کو اور ہم نے ان میں سے
ہر ایک کو حکمت اور علم سے نوازا تھا۔ اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کا ہم نوا کر دیا تھا،
وہ اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے تھے اور یہ باتیں ہم ہی کرنے والے تھے! اور ہم نے اس کو
تمہارے لیے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے تو کیا تم بھی
اسی طرح شکر کرنے والے بنتے ہو! ۷۸-۸۰

اور ہم نے سلیمان کے لیے باد تند کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں۔ اور شیاطین میں سے بھی ہم نے اس کے لیے مسخر کیے تھے جو اس کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے، اور ہم ان کو سنبھالنے والے تھے۔ ۸۱-۸۲

اور ایوب پر بھی ہم نے رحمت کی۔ جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مبتلائے آزار ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے! تو ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ہم نے اس کی تکلیف دور کر دی اور اس کو اس کے اہل و عیال بھی دیے اور ان کے مانند ان کے ساتھ اور بھی خاص اپنے فضل سے اور عبادت گزاروں کی یاد دہانی کے لیے۔ ۸۳-۸۴

اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل پر بھی ہم نے فضل کیا یہ سب ثابت قدموں میں سے تھے۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا، بے شک وہ نیکو کاروں میں سے تھے۔ ۸۵-۸۶

اور ذوالنون پر بھی ہم نے رحم کیا جب کہ وہ قوم سے برہم ہو کر چل کھڑا ہوا اور اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ پس اس نے تاریکیوں کے اندر پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، بے شک میں ہی قصوروار ہوں! تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔ ۸۷-۸۸

اور زکریا پر بھی فضل کیا کہ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو ہے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے سازگار کر دیا۔ بے شک یہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والے اور امید و بیم ہر حال میں ہماری ہی عبادت کرنے والے اور ہمارے آگے سرفگندہ رہنے والے تھے۔ ۸۹-۹۰

اور اس (پاک دامن بی بی) پر بھی اپنا فضل کیا جس نے اپنے اندیشہ کی جگہوں کی حفاظت کی تو ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا والوں کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔ ۹۱

یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمھارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو۔ اور انھوں نے اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہر ایک کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے! تو جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان پر بھی ہوگا اس کی سعی رائگاں جانے والی نہیں، ہم اس کے لیے اس کو لکھ رکھنے والے ہیں۔ ۹۲-۹۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْہِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَالطَّیْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِیْنَ (۷۸-۷۹)

داؤد و سلیمان یہاں اسی طرح منصوب ہیں جس طرح اوپر 'نُوْحًا' منصوب ہے یعنی سیاقِ کلام کی روشنی میں کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ ہم نے ترجمہ میں اس محذوف کو کھول دیا ہے۔

'نفش' کے معنی بکریوں یا مویشیوں کا شب میں چرنا اور 'فَفَهَّمْنٰهَا' میں ضمیر مؤنث اس مرجع کے لیے آئی ہے جو سیاق کلام سے مستنبط و متبادر ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت داؤدؑ کے ایک مقدمہ کی طرف اشارہ اور اس اشارہ سے مقصود داؤدؑ و سلیمانؑ کی عدل گستری

یہاں ایک مقدمہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حضرت داؤدؑ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس مقدمہ کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی ہے۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی بکریوں کا ریوڑ کسی کے کھیت میں جا پڑا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اس کا فیصلہ فرمایا لیکن اس فیصلہ میں وہ معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ نے، جو ابھی کمسن ہی تھے، اپنی رائے پیش کی جو زیادہ صائب اور قرینِ عدل تھی۔ بالآخر حضرت داؤدؑ نے انھی کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ یہ سوال کہ باپ نے کیا فیصلہ کیا اور بیٹے نے کیا رائے دی، خارج از بحث ہے اس لیے کہ قرآن کا مقصد یہاں مقدمہ کی روداد پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ایک تو یہ دکھانا ہے کہ حضرت داؤدؑ ایک حکمران اور پیغمبر ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں میں اتنے محتاط تھے کہ اپنے ایک اجتہاد کا ضعف، اپنے ایک کم عمر فرزند کے توجہ دلانے

سے بھی جب ان پر واضح ہو گیا تو انھوں نے فوراً اپنا فیصلہ بدل دیا اور اپنے سے ایک فرد تر کی رائے قبول کر لی۔ دوسری یہ بات دکھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو ایک ایسا فرزند عطا فرمایا جو اپنے عنفوانِ شباب ہی سے ایسی اعلیٰ قوتِ فیصلہ رکھتا تھا کہ بسا اوقات اپنے عظیم باپ کو بھی مشورے دیتا تھا اور باپ اس کے فیصلوں کی قدر کرتا تھا۔ یہ کسی باپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ایسا لائق بیٹا عطا ہو جو امورِ حکومت میں نہ صرف اس کا دست و بازو بنے بلکہ بسا اوقات اس کی رہنمائی بھی کرے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں اس مقدمہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس مقدمے کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ قرآن سے ایک بالکل خارج چیز ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان کی نوعیت بالکل مفروضات کی ہے اور ہم مفروضات کے درپے ہونا پسند نہیں کرتے۔

حکمران کا اصل جوہر

'وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ' یعنی ہم اس خاندان کے لوگوں کو اپنی زمین میں حکومت دے کر بالکل الگ تھلگ نہیں جا بیٹھے تھے بلکہ دیکھتے رہے تھے کہ وہ کیا بناتے ہیں، رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرنے کا ان کو کتنا احساس ہے، اور اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں وہ کتنے زیرک، کتنے محتاط اور کتنے بے نفس اور غیر جانبدار ہیں۔ چنانچہ ان باپ بیٹے نے یہ ثابت کر دیا کہ دونوں اس منصب کے پوری طرح اہل ہیں۔ بیٹے نے جونہی محسوس کیا کہ باپ سے دربابِ عدل لغزش ہوئی اس نے اپنا حقِ نصیحت ادا کیا اور باپ نے جونہی محسوس کیا کہ بیٹے کی رائے زیادہ قرینِ عدل ہے بے چون و چرا اس نے حق کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا۔ یہی کردار حکمرانی کا اصل جوہر ہے اور اللہ تعالیٰ جن کو اپنی زمین میں خلافت دیتا ہے اسی جوہر کو پرکھنے کے لیے دیتا ہے۔

'وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا' یعنی ان کا یہی جوہر ہے جس کی بنا پر ہم نے ان میں سے ہر ایک کو حکمت اور نبوت سے نوازا۔

حکمرانی کے ساتھ درویشی

'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ' یہ حضرت داؤدؑ کی درویشی کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو تختِ حکومت پر بٹھایا تھا، وہ پوری بیدار مغزی اور بے نفسی کے ساتھ رعایا کے اندر امن و عدل قائم کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کے تعلق باللہ کا یہ حال تھا کہ وہ شب میں پہاڑوں میں نکل جاتے اور ان کے حمد و تسبیح کے نغموں اور گیتوں کی صدائے بازگشت پہاڑوں میں گونجتی اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت داؤدؑ نہایت خوش الحان تھے اور اس خوش الحانی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر سوز و درد بھی تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی تمام مناجاتیں گیتوں اور نغموں کی شکل میں ہیں اور یہ گیت الہامی ہیں۔ ان گیتوں کا حال یہ ہے کہ زبور پڑھیے تو اگرچہ ترجمہ میں ان کی شعری روح نکل چکی ہے لیکن آج بھی ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل سینہ سے نکل پڑے گا۔ حضرت داؤدؑ جیسا خوش الحان اور صاحبِ سوز و درد جب ان الہامی گیتوں کو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر، سحر کے سہانے وقت میں، پڑھتا رہا ہو گا تو یقیناً پہاڑوں سے بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی ہو گی

اور پرندے بھی ان کی ہمنوائی کرتے رہے ہوں گے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ ان کا یہ شوقِ تسبیح اس وقت اور بھڑک اٹھتا ہے۔ جب کوئی صاحب درد کوئی ایسا نغمہ چھیڑ دیتا ہے جو ان کے دل کی ترجمانی کرتا ہے، اس وقت وہ بھی جھوم اٹھتے ہیں اور اس کی لَے میں اپنی لَے ملاتے ہیں۔ اگر پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح ہم نہیں سنتے سمجھتے تو یہ خیال نہ کیجیے کہ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں سنتا سمجھتا۔ وہ لوگ اس کو سنتے اور سمجھتے ہیں جن کے سینوں میں دل گداختہ ہوتا ہے۔ مولانا رومؒ نے خوب بات فرمائی ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است

از حواس انبیاء بے گانہ است

اسی حقیقت کی طرف مرزا غالب نے یوں اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس ٹکڑے کا اسلوبِ بیان بھی قابلِ غور ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ 'سَخَّرْنَاهُ' بلکہ اسلوب بدل کر 'سَخَّرْنَا مَعَهُ' فرمایا۔ 'معہ' سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی تسبیح میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو بھی ان کا شریکِ بزم بنا دیا تھا۔ جب وہ اپنا نغمۂ حمد چھیڑتے تو یہ بھی ان کی ہمنوائی کرتے۔

زبان کا ایک نکتہ یہاں معطوف اور معطوف علیہ یعنی 'جِبَالَ' اور 'طَیْر' کے درمیان فعل 'یُسَبِّحْنَ' حائل ہے۔ حالانکہ نظام اس کو 'طیر' کے بعد آنا چاہیے۔ فعل کی اس تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ پرندوں کی تسبیح خوانی تو ایک معروف بات ہے البتہ پہاڑوں کی نواسنجی ایک نادر بات تھی۔ اس وجہ سے فعل کو ان سے متصل کر دیا۔

خدا ساز بات وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ یعنی یہ کام کسی اور کے کرنے کے نہیں بلکہ ہمارے ہی کرنے کے تھے اور ہم ہی ان کے کرنے والے بنے۔ ہم جس کے لیے چاہیں شجر و حجر، دریا، پہاڑ اور چرند و پرند ہر چیز کو اس کے پیچھے لگا دیں۔ خدا کی نعمتیں کسی کو اس کے اپنے زور و اقتدار سے نہیں ملتیں بلکہ خدا ہی کے دینے سے ملتی ہیں۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (۸۰)

رات کا راہب اور دن کا شہسوار یعنی یہ زاہد شب زندہ دار یہ نہ سمجھو کہ صرف تنہائی کے گوشوں میں بیٹھ کر 'اللہ ھو' کرنے والا ہی تھا بلکہ یہ جس طرح رات کا راہب تھا اسی طرح دن کا شہسوار بھی تھا۔ ہم نے جنگ کے حملوں سے حفاظت کے لیے اس کو ایک خاص لباس بنانے کی تعلیم دی۔ اس خاص لباس سے اشارہ زرہ کی طرف ہے۔ اس کے موجد حضرت داؤدؑ ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ زرہ کی جو اعلیٰ قسمیں حضرت داؤدؑ نے ایجاد کیں ویسی زرہیں ان سے پہلے وجود میں نہیں آئی تھیں۔ عربوں کی رزمیہ شاعری میں داؤدی ساخت کی زرہوں کا ذکر بہت آتا ہے۔ اس عہد کے

دفاعی اسلحہ میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل رہی ہے۔ اب زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ ان آلات و اسلحہ کی اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن جس زمانے کی یہ بات ہے اس زمانے میں حضرت داؤدؑ اپنی انہی ایجادات کی بدولت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کے مالک تھے۔ مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ باللیل رهبان و بالنهار فرسان کی صحیح تصویر تھے۔ ایک طرف ان کی پرسوز دعاؤں اور مناجاتوں سے پہاڑوں کا دل موم ہوتا، دوسری طرف ان کی جنگی ایجادات اور ان کی فوجی یلغاروں سے دشمنوں پر لرزہ طاری رہتا۔

شکر میں حضرت داؤدؑ کی پیروی کی دعوت

'فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ' حضرت داؤدؑ کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے بعد مخاطبوں کو خطاب کر کے سوال کیا کہ کیا اس طرح کے شکرگزار بندے بننے کا حوصلہ تم بھی رکھتے ہو! حکمت، نبوت، حکومت اور قوت سب کچھ پا کر حضرت داؤدؑ کے فقر و درویشی کا یہ حال تھا! دین و دنیا کی یہی بہم آمیزی خدا کو مطلوب ہے اور خدا کے شکرگزار بندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ کہ وہ بہیز لوگ جو داؤدؑ و سلیمانؑ کی سطوت و عظمت کے گیت تو بہت گاتے ہیں لیکن دنیا کے کتے بنے ہوئے ہیں:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (۸۱)

حضرت سلیمانؑ کا عظیم بحری بیڑا

یہاں 'لِ' اس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سَخَّرْنَا' محذوف ہے۔ 'سَخَّرْنَا لَهٗ' کا مفہوم ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'لِ' کے صلہ کے ساتھ یہ لفظ کسی شے کو کسی کی خدمت میں لگا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی ہم نے تند ہواؤں کو بھی مسخر کر کے سلیمانؑ کی خدمت میں لگا دیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی بری قوت تو بہت تھی لیکن ان کی حکومت کی بحری قوت میں بے مثال ترقی حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی۔ انھوں نے ایسے بادبانی جہاز ایجاد کیے جو ہندوستان اور مغربی جزائر تک سفر کرتے تھے۔ ان کا بحری بیڑا وقت کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا تھا۔ بحر احمر میں اس کا مرکز ترسیس تھا جو خلیج عقبہ میں واقع تھا اور بحر متوسط میں صور، طائر اور دیافہ کی بندرگاہیں۔ اس زمانے تک سمندری ہواؤں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بادبان ہی تھے۔ یہی بادبان جہازوں کے لیے انجن کا کام دیتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے ایسے بادبان ایجاد کیے جو تند ہواؤں میں بھی جہاز کی آمد و رفت میں خلل واقع نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اپنی معینہ سمتوں میں، موافق و ناموافق ہر قسم کی ہوا میں، اپنے لمبے لمبے سفر بے خوف و خطر جاری رکھتے۔ یہ چیز چونکہ خدا کی سکھائی ہوئی سائنس کا ثمرہ تھی اس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے سلیمانؑ کے لیے تند ہوائیں مسخر کر دی تھیں جو اس کے حکم سے چلتی تھیں۔

'الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے اشارہ فلسطین اور شام وغیرہ کے علاقے ہیں جو زرخیز ہونے کے سبب سے تجارتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھنے والے تھے۔

'وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ' بعینہٖ یہی فقرہ معمولی تغیر کے ساتھ آیت ۵۱ میں حضرت ابراہیمؑ کی شان

میں وارد ہوا ہے۔ وہاں ہم اس کا مفہوم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی صلاحیتوں اور ان کے ظرف اور حوصلہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس وجہ سے ہم نے ان کو اپنی ہواؤں پر یہ تصرف بخشا اور ہم یہ کچھ دے کر اپنی آنکھیں موند کر بیٹھ نہیں گئے تھے بلکہ ہر چیز کو جانتے اور دیکھتے رہے تھے کہ سلیمان ہماری بخشی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہی نکتہ ہے جو ہمارے اس عہد کے سائنسدانوں کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

تسخیرِ کائنات خدا کا فضل ہے

انھیں تسخیر کائنات کی مہمات میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کو وہ خدا کا فضل سمجھنے کے بجائے اپنی ذہانت کا کرشمہ تصور کرتے ہیں حالانکہ انسان کو جو کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی بخشی ہوئی عقل اور خدا ہی کی رہنمائی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اوپر وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ سے اشارہ فرمایا ہے۔ پھر جب انسان اس مغالطہ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کی یہ تمام ایجادات اس کا اپنا کارنامہ ہیں تو اس مغالطہ کے بطن سے ایک اور مغالطہ جنم لیتا ہے جو اس سے بھی زیادہ مہلک ہے، وہ یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ان حاصل کردہ قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ قرآن نے وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ سے اس مغالطہ پر بھی ضرب لگائی ہے کہ قدرت نادان نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے خزانوں کی کنجیاں پکڑا کر خود کنارہ کش ہو کر بیٹھ رہے، لوگ جو چاہیں بناتے اور کرتے پھریں، بلکہ وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور جب وہ آگاہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی بخشی ہوئی قوت کو اگر کسی نے غلط استعمال کیا تو وہ لازماً اس کے لیے ایک دن مسئول ہو گا۔ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام اس رمز سے خوب آگاہ تھے اس وجہ سے بحر و بر دونوں میں عظیم کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوئے کہ یہ ان کے اپنے کارنامے ہیں بلکہ انھوں نے ان ساری چیزوں کو خدا کا فضل سمجھا اور جو قدم بھی اٹھاتے یہ سوچ کر اٹھاتے کہ ایک دن ان کو خدا کے سامنے پیش ہونا اور اپنے ہر عمل کی جواب دہی کرنی ہے۔ یہی احساس ہے جو انسان کو خدا کا حقیقی شکر گزار و تابعدار بندہ بناتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی زندگی کا یہ پہلو انشاءاللہ سورۂ نمل کی تفسیر میں تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (۸۲)

حضرت سلیمانؑ نے مفسد عناصر کو تعمیری تمدن کی خدمت میں استعمال کیا

شیاطین سے مراد وہ شیاطین جن ہیں جن کو حضرت سلیمانؑ نے مسخر کر رکھا تھا۔ قرآن اور تورات دونوں سے ثابت ہے کہ ان کے پاس انسانوں، جنوں اور پرندوں کی باقاعدہ فوج تھی جس کی پریڈ ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً فرمایا ہے۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (نمل - ۱۸) (اور سلیمان کے قبضہ میں جنوں، انسانوں اور پرندوں کی فوجیں تھیں جن کا جائزہ ہوتا رہتا تھا) سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کی فوج کے ایک عفریت جن کا بھی ذکر ہے۔ جس نے ان سے کہا کہ اگر حضور کا حکم ہو تو میں ملکۂ سبا کا تخت آپ کے دربار سے اٹھنے سے پہلے پہلے حاضر کر دوں۔ یہ جن سمندروں میں غوطہ لگا کر سمندری دولت، مونگے موتی وغیرہ بھی فراہم کرتے تھے اور دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح کے مفسد عناصر کو مسخر کر کے انسانیت کی مفید

خدمت میں استعمال کرنا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور ایک لائق حکمران کا اصلی کام یہی ہے کہ وہ نہ صرف مفید عناصر کو بلکہ مضر عناصر کو بھی اپنے علم و حکمت سے تعمیر و تمدن اور اصلاح و ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ان شیاطین کو مسخر کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کو جو علم عطا ہوا تھا اس پر مفصل بحث بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے تحت ہاروت و ماروت کے ضمن میں، ہم کر چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے شیاطین سے ان کافر قوموں کو مراد لیا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے زیر نگیں تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ اس لفظ سے ایک قسم کا تجاوز ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قرآن میں یہ لفظ اشرار جن اور اشرار انس دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن مطلق کافر قوموں کے لیے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے کافر قوموں کے اشرار مراد ہیں تو لفظ کے اندر اس کی بھی گنجائش ہے لیکن اصلاً نہیں تبعاً۔ اصلاً اس سے مراد جنوں ہی کے اشرار ہوں گے۔

ہمارے عہد کے سائنس والوں کا ایک مغالطہ

وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ یعنی ان شیطانی قوتوں کو حضرت سلیمانؑ کے لیے ہم نے جو مسخر کر دیا تھا تو یہ نہیں تھا کہ وہ مجرد ان کے اپنے بل بوتے پر ان کے قابو میں تھیں بلکہ ان کے اصلی نگران ہم تھے۔ ہمیں نے اپنے فضل سے ان کو سلیمانؑ کے قابو میں کر دیا تھا اور ہم ہی ان کی نگرانی کرنے والے تھے کہ نہ ان میں سے کوئی بھاگ سکے نہ کوئی حضرت سلیمانؑ کے منشا کے خلاف کوئی تعدی کر سکے۔ اگر ہم ان کے نگران نہ ہوتے تو یہ بے قابو ہو کر خطرے و آفت کا سبب بھی بن سکتی تھیں۔ اس ٹکڑے میں ایک بہت بڑی تنبیہ ہے ان لوگوں کے لیے جو قدرت کی بعض قوتوں کو تسخیر کر کے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب یہ ان کے مالک ہیں، نہ ان کو ان سے کوئی چھین سکتا اور نہ یہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کر سکتیں۔ یہ خیال محض انسان کی تنگ ظرفی اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ آج انسان نے بھاپ، گیس بجلی اور ایٹم وغیرہ کی جو قوتیں اپنے قابو میں کر رکھی ہیں ان پر خدا ہی نے انسان کو قابو دیا ہے اور یہ اسی وقت تک انسان کے قابو میں ہیں جب تک خدا چاہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی قوت کی باگ بھی ذرا ڈھیلی چھوڑ دے تو یہی قوتیں، جن کی مدد سے انسان آسمان و زمین کے قلابے ملا رہا ہے، چشم زدن میں اس کے سارے خرمن کو سوخت کر کے رکھ دیں۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ (۸۳-۸۴)

حضرت ایوبؑ اور ان کا مثالی صبر

شکر کی دو اعلیٰ مثالیں پیش کرنے کے بعد اب یہاں انبیائے کرامؑ کا ذکر آ رہا ہے جنھوں نے صبر کی نہایت اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت ایوبؑ کا ذکر فرمایا ہے۔ سِفر ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک عوض میں حضرت ایوبؑ ایک نہایت کامل اور راستباز انسان تھے۔ خدا نے انھیں بڑا خاندان اور بڑی دولت دے رکھی تھی۔ ان کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، ایک ہزار بیل اور پانچ سو بار برداری کے گدھے ان کے پاس تھے۔ ان کے نوکر چاکر بھی بے شمار تھے۔ اہل مشرق میں اس درجہ کا مالدار کوئی اور نہ تھا لیکن یہ تمام خدم و حشم رکھنے کے باوجود وہ خدا کے نہایت شکر گزار اور فرمانبردار بندے

تھے کبھی کسی برائی سے وہ آلودہ نہ ہوئے۔

ان کی اس نیکی پر شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو حسد ہوا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ ایوب کی یہ خدا پرستی وراستبازی اس لیے ہوئی کہ خدا نے اسے ہر طرح کی خوشحالیاں دے رکھی ہیں۔ اگر یہ ان سے محروم ہو جاتے تو پھر کبھی خدا کا شکر گزار نہ ہوں گے۱؎

اس پر اور خدا کی طرف سے ان کے لیے آزمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے مویشی لوٹ لیے گئے، نوکر چاکر قتل ہو گئے، اولاد مر گئی اور دولت، وحشمت سب غائب ہو گئی لیکن حضرت ایوبؑ خدا سے مایوس ہونے کے بجائے اسی کے دروازے پر گر پڑے۔ سفر ایوب میں ہے کہ

"وہ سجدے میں گر پڑا اور کہا میں اپنی ماں کے پیٹ سے برہنہ پیدا ہوا تھا اور برہنہ ہی دنیا سے جاؤں گا۔ خداوند نے مجھے دیا تھا اور خداوند نے لے لیا اس کے نام کے لیے ساری پاکیاں اور مبارکیاں ہوں۔"

سفر ایوب ۱: ۲۲

مالی آفات ومصائب کے بعد جسمانی تکالیف وآلام کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ،

"ایوب کے تلوے سے لے کر سر کی چاندی تک سارے جسم میں جلتے ہوئے پھوڑے نکل آئے۔ وہ ایک ٹھیکرا لے کر اپنا جسم کھجاتا اور راکھ پر بیٹھا رہتا۔" سفر ایوب ۲: ۸

حضرت ایوب نے ان تکالیف کا بھی اسی صبر ورضا کے ساتھ مقابلہ کیا جس صبر ورضا کے ساتھ انھوں نے مالی آفات ومصائب کا مقابلہ کیا بالآخر اس امتحان سے بھی وہ بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے زیادہ دیا جو انھوں نے کھویا تھا۔

"اور خداوند نے ایوب کی حالت بدل دی۔ اسے پہلے کی نسبت دو چند دولت عنایت کی۔ اس کے تمام عزیزوں کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ اسے آخری عمر میں پہلے کی طرح اولاد ملی۔ وہ ایک سو چالیس برس تک جیا اور اپنی نسل کی چار پشتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ سفر ایوب ۴۲: ۱۰

مقام رضا اور اس کا اجر

أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ‘ اس دعا کی اس بلاغت کو ملحوظ رکھیے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنے دکھ اور درد کا حوالہ تو دیا لیکن حرفِ مدعا کو زبان پر نہیں لائے۔ اس کو خدا کی رحمت پر چھوڑ دیا۔ فرمایا کہ میں دکھی ہوں اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا دکھ تیرے آگے پیش کرتا ہوں اور معاملہ تیری رحمت کے حوالہ کرتا ہوں تو جو کچھ کرے گا اپنی شانِ رحیمی کے مطابق کرے گا اور اسی میں میرے لیے برکت ورحمت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو مقامِ رضا کہتے ہیں۔ جو اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے اسی کو آخرت میں 'راضیۃ مرضیۃ' کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس دنیا میں انسان کو جن حالات اور

۱؎ سفر ایوب۔ ۱: ۹-۱۱

آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے ان میں یہ متعین کرنا کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے خیر کس میں ہے، انسان کے لیے نہایت مشکل ہے۔ وہ بسا اوقات جس چیز کو چاہتا ہے اس کی عاقبت کے پہلو سے اس کے لیے فلاح و سعادت اس کے ضد پہلو میں ہوتی ہے اس وجہ سے ان تمام امور میں، جن میں خیر کا پہلو خدا کی طرف سے معین نہ ہو، معاملہ کو اللہ کے حوالہ کرنے ہی میں سعادت ہے۔ وہی جانتا ہے کہ بندے کے لیے بیماری بہتر ہے یا تندرستی، موت بہتر ہے یا زندگی۔

فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی دعا قبول فرمائی۔ ان کی وہ تمام تکالیف بھی دور فرما دیں جن میں وہ مبتلا تھے اور ان کے اہل و عیال اور ان کے خدم و حشم بھی ان کو از سر نو عطا فرمائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرت ایوبؑ نے اپنی دعا میں صرف اپنی تکالیف کی طرف اشارہ فرمایا، آل و اولاد اور مال و اسباب کے لیے کسی تمنا کا اظہار نہیں کیا سو جن حالات میں مبتلا تھے ان میں ان کے لیے یہی بڑی چیز تھی کہ ان کے دکھ کا ازالہ ہو جائے، اس سے زیادہ کے لیے ارمان کرنے کی کہاں گنجائش تھی! لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو وہ بھی دیا جو انھوں نے مانگا اور وہ بھی دیا جس کا وہ اپنی تواضع کے سبب سے اب اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھ رہے تھے۔

وَاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس دور آزمائش میں ان کے جو اہل و عیال اور اعزا و اقربا منتشر ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی اکٹھا کر دیا، جو وفات پا گئے تھے ان کے نعم البدل بھی دیے اور ان کے متعلقین کے دائرے کو مزید وسیع بھی کر دیا۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ جو کچھ ہوا خاص ہمارے فضل سے ہوا۔ حالات بظاہر بالکل مایوس کن تھے، نہ ایوبؑ اس کی توقع کر سکتے تھے نہ کوئی دوسرا لیکن ہم نے اپنی رحمت سے اپنے بندے ایوبؑ کے لیے سب کچھ کر دیا۔ وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ۔ یعنی یہ ہم نے اس لیے بھی کیا کہ یہ واقعہ ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک یادگار واقعہ ہو کہ ہمارے جو بندے ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں ہمارے ہی ساتھ وابستہ رہتے ہیں ہم اسی طرح ان پر اپنا فضل کرتے ہیں اور کریں گے۔

اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۸۵-۸۶)

حضرت اسمٰعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام پر سورۂ مریم کی آیات ۵۴-۵۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں نبیوں میں جو وصفی مماثلت ہے اس کی طرف بھی ہم نے وہاں اشارہ کیا ہے۔ یہاں ان کے ساتھ حضرت ذوالکفل کو بھی شامل کر دیا اور ان تینوں ہی حضرات کے باب میں فرمایا کہ "كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت صبر ان تینوں ہی حضرات کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان میں سے حضرت اسمٰعیل کا صبر تو واضح طور پر معلوم ہے قرآن میں جگہ جگہ ان کے صبر کا ذکر ہے لیکن حضرت ادریسؑ اور حضرت ذوالکفل کی سرگزشت حیات

بالکل پردۂ خفا میں ہے۔ قدیم صحیفوں میں ان ناموں سے ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اب یا تو یہ ہوا ہے کہ عربی لب ولہجہ میں یہ نام بالکل بدل گئے ہیں یا قدیم صحیفوں سے ان کے نام غائب ہوگئے صرف قرآن نے ان کو از سرِ نو زندہ کیا۔ جو شکل بھی ہوئی ہو بہر حال ان دونوں نبیوں کے بارے میں میری ناچیز معلومات میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ذوالکفل کو حضرت حزقیل پر منطبق کیا ہے۔ لیکن یہ اسی شکل میں قابلِ اعتماد ہے جب یہ ثابت ہوسکے کہ حضرت حزقیل اس لقب سے ملقب تھے۔ ان دونوں نبیوں کے نام قرآن ہی کے ذریعہ سے متعارف ہوئے ہیں اور صبر ان کی نمایاں خصوصیت بتائی گئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تورات یا قرآن کسی میں بھی جملہ انبیائے کرام کے نام اور حالات مذکور نہیں ہیں۔ تمام انبیائے کرام کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۸۷)

ذوالنون علیہ السلام کی لغزش کی نوعیت

ذوالنون سے مراد حضرت یونسؑ ہیں۔ قدیم صحیفوں میں ان کا نام یوناہ آیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر ذوالنون (مچھلی والا) کے لقب سے کیا ہے۔ نون، مچھلی کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان کو مچھلی نے نگل لیا تھا اس وجہ سے ان کو یہ لقب عطا ہوا جس میں مچھلی کے واقعہ کی تلمیح بھی ہے اور ایک قسم کا پیار بھی۔

حضرت یونسؑ اہلِ نینوا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ نینوا کی آبادی، صحیفۂ یونس کی روایت کے مطابق، ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ قرآن کی سورۂ صافات میں بھی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں جس سے اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت یونسؑ نے ایک مدت تک اہلِ نینوا کو دعوت دی لیکن کسی نے ان کی بات نہیں سنی۔ بالآخر ان پر حق کی حمیت غالب آئی اور قوم کی اس ناقدری و سنگ دلی سے مایوس و آزردہ ہو کر وہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ جب ان پتھروں میں جونک لگنا ممکن نہیں ہے تو کیوں ایسے ناقدروں کے پیچھے اپنا وقت برباد اور ان کی خاطر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا رکھا جائے؟ حق کی ناقدری کس بے بسی پر ایک صاحبِ حق کے اندر یہ جذبہ پیدا ہونا ایک امرِ فطری ہے لیکن اس جذبہ کے غلبہ میں معاملہ کا ایک دوسرا نہایت اہم پہلو حضرت یونسؑ کی نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔ وہ یہ کہ خدا کے رسول کو اپنی قوم کو کب چھوڑنا چاہیے؟ یہ اس کے اپنے فیصلہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ خدا ہی کے فیصلہ کرنے کی ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے اور کب کسی رسول کے لیے یہ روا ہے کہ وہ اپنی قوم سے اعلانِ براءت کر کے ہجرت کرے اور قوم کو اللہ کے عذاب کے حوالہ کرے۔ حضرات انبیاء کے لیے ہمیشہ یہ سنتِ الٰہی رہی ہے کہ وہ خدا کے اذن کے بغیر اپنی قوم کو نہ چھوڑیں اگرچہ ان کے سر پر آرے ہی کیوں نہ چلتے رہیں اور اگرچہ ایک شخص بھی ان کی دعوت پر کان دھرنے والا نہ نکلے۔ حضرت یونسؑ حمیتِ حق کے جوش میں اس سنتِ الٰہی کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ ایک طویل مدت تک لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کے بعد بھی جب کوئی ان کی بات کو سننے والا نہیں نکلا تو اب عند اللہ وہ بری الذمہ ہیں، انھیں ایسی ناہنجار قوم کو خدا کے

عذاب کے حوالہ کر کے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ اپنے کو بری الذمہ سمجھنے کے معنی یہ بھی تھے کہ وہ اپنے اس اقدام پر خدا کی طرف سے کسی گرفت کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا گمان یہ تھا کہ اس طرح وہ اس ابتلاء سے چھوٹ جائیں گے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

حضرت یونسؑ کا یہ خیال بجائے خود ایک پاکیزہ جذبہ پر مبنی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو آزمائشیں مقرر کر رکھی ہیں وہ لازماً پوری ہو کے رہتی ہیں۔ وہ قوم سے بیزار ہو کر، ایک کشتی میں، جو سفر پر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی، سوار ہو گئے۔ کشتی کچھ منزل طے کرنے کے بعد طوفان میں گھر گئی۔ جب طوفان کسی طرح ٹلتا نظر نہیں آیا تو ملاحوں نے اس زمانے کے عام وہم کے مطابق یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس کشتی میں اپنے آقا سے بھاگا ہوا کوئی غلام سوار ہو گیا ہے، جب تک اسے پکڑ کر سمندر کے حوالے نہ کیا جائے گا اس طوفان سے نجات نہیں مل سکتی۔ بالآخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کشتی میں مفرور غلام کون ہے قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت، جیسا کہ سورۂ صافات میں اشارہ ہے، حضرت یونسؑ ہی کے سپرد ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہو گی کہ تمام اہل کشتی میں لوگوں کو سب سے زیادہ ثقہ آدمی وہی نظر آئے ہوں گے۔ بہرحال قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ حضرت یونسؑ کے نام کا نکلا جس کے نتیجے میں وہ کشتی سے سمندر میں لڑھکا دیے گئے۔ سمندر میں ان کو کسی بڑی مچھلی غالباً وہیل نے نگل لیا لیکن خدا کے رسول کو ہضم کرنا آسان نہیں ہے۔ حضرت یونسؑ نے جب دیکھا کہ مشکلات کی تاریکی سے نکلنے کی جو راہ انھوں نے اختیار کی اس نے ان کو اس سے بھی زیادہ گہری تاریکیوں میں ڈال دیا تو ان کے دل سے وہ زندۂ جاوید دعا نکلی جس کے لیے یہ ضمانت ہے کہ وہ اگر صدق دل سے کی جائے تو کبھی قبولیت سے محروم نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مچھلی نے ان کو ساحل کی ریت پر اگل دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے نڈھال جسم کو گرمی اور دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے کدو یا اسی قسم کی کوئی بیل اگا رکھی تھی۔ جس کے نیچے ان کو پناہ ملی۔ جب اس حادثہ سے اوسان بجا ہوئے اور جسم میں کچھ جان آئی تو ان کو پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت ہوئی۔ صحیفۂ یونس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوبارہ انذار کے لیے قدرت نے ایک مؤثر تقریب بھی پیدا کر دی۔ وہ یوں کہ وہ بیل جس کے سایہ نے حضرت یونسؑ کو امان دی تھی، کسی سبب سے دفعتہً سوکھ گئی۔ احسان شناس لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے احسان کی بھی قدر کرتے ہیں۔ حضرت یونسؑ کو اس یادگار بیل کے یوں خشک ہو جانے کا احساس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کو توجہ دلائی کہ ایک حقیر بیل جس کے لگانے اور پروان چڑھانے پر تم نے کوئی محنت نہیں کی، سوکھ جانے پر تم یوں ملول ہوئے تو غور کرو کہ میں اس عظیم نینوا کو کس طرح اپنے عذاب کے حوالے کر سکتا ہوں جس کو میں نے پیدا کیا، جس کی پرورش کی اور جس کو پروان چڑھایا ہے! جاؤ ان کو پھر دعوت دو، شاید وہ نیکی کی راہ اختیار کریں اور میری رحمت کے مستحق ٹھہریں۔ اس ہدایت کے مطابق حضرت یونسؑ پھر اہل نینوا کے پاس انذار کے لیے گئے اور ان کی اس دوبارہ دعوت و تذکیر کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ سے لے کر نینوا کے عام باشندے تک سب کانپ اٹھے، سب خدا پر ایمان لائے، بادشاہ

نے شاہی لباس اتار کر ٹاٹ کا پیرہن پہن لیا اور باشندوں کے نام فرمان جاری کیا کہ ہر کوئی اپنی بری راہ سے باز آجائے، روزہ رکھے، خدا کے حضور زاری کرے اور توبہ و انابت، کا سر جھکائے!!

حضرت یونسؑ کے واقعہ کی روایت میں، چونکہ مفسرین نے بڑا گھپلا کر دیا ہے، اس وجہ سے میں نے اس کی صحیح نوعیت واضح کرنے کے لیے اس کی تفصیل پیش کر دی۔ یہ تفصیل صحیفۂ یونسؑ اور قرآن کی تصریحات و اشارات پر مبنی ہے۔ آگے سورۂ صافات کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر اب آیت کے اجزاء پر غور کیجیے۔

قوم کی ناقدری پر غصہ

'اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا'۔ 'مُغَاضِبًا' کا مفعول بیان بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی اپنی قوم سے ناراض و آزردہ ہو کر وہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ آزردگی و ناراضگی ظاہر ہے کہ اسی بات پر ہو سکتی ہے کہ انھوں نے متنبہ کرنے کے لیے سارے جتن کر ڈالے لیکن اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی بلکہ حق کی توہین کرتی اور ان کی باتوں کا مذاق اڑاتی رہی۔

حضرت یونسؑ کے اقدام کا ایک مخفی پہلو

'فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ'۔ یعنی وہ سمجھے کہ اس طرح وہ اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے جس میں اس وقت قوم کے ہاتھوں وہ مبتلا ہیں۔ اسی جوش غیرت میں ان کو اس بات کی طرف توجہ نہیں ہوئی کہ جس محاذ پر ان کو خدا نے مامور کیا ہے اگر وہ خدا کے حکم کے بغیر اس کو چھوڑیں گے تو خدا ان کو اس سے بھی کسی بڑی آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ اس فقرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقدام کے ایک ایسے پہلو پر عکس ڈالا ہے جس پر اگرچہ حضرت یونسؑ کی نظر نہیں پڑی تھی لیکن وہ اس کے اندر مضمر تھا۔ حضرت یونسؑ یہ گمان تو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو خدا کی گرفت سے باہر ہو جائیں گے۔ البتہ یہ گمان ان کو ہوا ہوگا کہ ان ناہنجاروں سے الگ ہو کر میں اس جنجال سے نکل جاؤں گا جس میں اس وقت ان کی خاطر مبتلا ہوں اور بقیہ زندگی یکسو ہو کر گزاروں گا۔ یہ گمان بجائے خود کوئی معصیت نہیں ہے لیکن رسول، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا،

رسول محاذ پر مامور ایک مجاہد ہے

اللہ تعالیٰ کی طرف سے محاذ پر مامور ایک مجاہد کی حیثیت رکھتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے سے میدان چھوڑے اگرچہ اس چھوڑنے کا محرک حمیت حق کا جذبہ ہی ہو۔ اگر وہ ایسا کرے تو درپردہ اس کے اندر یہ بات مخفی ہے کہ وہ خدا کے ابتلاء سے خود اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ یہ مخفی پہلو حضرت یونسؑ پر واضح نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو کھول دیا تاکہ اس کی سنگینی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی ایک اقدام کرتا ہے جو بالکل معصومانہ ہوتا ہے لیکن وہ ایک ایسے گمان کی بھی غمازی کرتا ہے جو غلط ہوتا ہے اور اس کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں ہوتی جب تک کوئی دانا اس کی طرف توجہ نہ دلائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت یونسؑ کے اسی گمان کو بے نقاب کیا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو۔ باطنی اصلاح و تربیت کے معاملہ میں یہی طریقہ حکیمانہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ تمام انسانیت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی ادنیٰ لغزش بھی صادر ہوتی ہے تو

رب حکیم و علیم اپنے خاص ایکسرے کے ذریعے سے ان کو دکھا دیتا ہے کہ ان کی یہ بات کہاں تک متعدی ہو سکتی ہے اگر اس کا تدارک نہ ہو۔

اس ٹکڑے کی اگر یہ تاویل لی جائے تو یہ عقل و فطرت کے بالکل مطابق بھی ہے، اس سے حضرت یونسؑ پر کوئی الزام بھی عاید نہیں ہوتا اور اس تکلف کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو لوگوں نے 'لَنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ' کی تاویل میں لغت سے تجاوز کر کے کیا ہے۔ حالانکہ اس تکلف کے بعد بھی وہ اس مشکل کو حل نہ کر سکے جو اس میں ہے۔

حضرت یونسؑ کی دعا

'فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'

یہاں اس واقعہ کی تفصیل حذف کر دی گئی ہے جو حضرت یونسؑ کو کشتی میں پیش آیا۔ صرف اس دعا کا ذکر فرمایا ہے جو مچھلی کے پیٹ اور قعر سمندر کی تاریکیوں کے اندر انھوں نے کی اور جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اس حذف کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ مقصود یہاں قصہ کی تفصیل نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ رب کریم تاریک سے تاریک حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی دعائیں قبول فرماتا اور اس کو بڑی سے بڑی آفت سے نجات دیتا ہے بشرطیکہ بندہ اپنے رب ہی کو ملجا و ماویٰ سمجھے اور اسی سے دعا و فریاد کرے۔

صحیفۂ یونس میں اس دعا کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے۔

"اس نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے دعا مانگی اور اس نے اس کی پکار سن لی تھی۔ وہ پاتال کے بطن میں سے چلایا اور اس کی پکار سنی گئی۔" ۲ : ۱

'ظُلُمٰت' کا مفہوم

لفظ 'ظُلُمٰت' اس تاریکی کی شدت اور اس کے اطراف کی وسعت اور اس کے ناپیدا کنار ہونے کو ظاہر کر رہا ہے۔ عربی زبان میں جمع کبھی کبھی کسی شے کے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے بھی آتی ہے۔ ہم اس کی مثال میں 'مشارق' و 'مغارب' کا حوالہ دے چکے ہیں۔ یہاں اس سے مراد مچھلی کے پیٹ اور پاتال کی گہرائیوں کی تاریکیاں ہیں۔ مقصود اس لفظ سے یہ واضح کرنا ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کو اپنی بات سنانے کے لیے کسی پبلک پلیٹ فارم یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے بندوں کی فریاد پاتال کی تاریکیوں اور سمندر کی گہرائیوں سے بھی سنتا اور ان کی فریاد رسی کرتا ہے۔

حضرت یونسؑ کا اعتراف تقصیر

'لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ حضرت یونسؑ کی دعا ہے۔ اس دعا میں ان کی طرف سے طلب و تمنا کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ صرف اپنی تقصیر کا اعتراف و اظہار ہے۔ اعتراف تقصیر کے بعد انھوں نے اپنے معاملے کو اپنے رب پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو فیصلہ فرمائے وہی حق ہے اور اسی میں حکمت و رحمت ہے اس لیے کہ وہ ہر عیب سے پاک ہے۔ سب سے پہلے خدا ہی کے معبود اور ملجا و ماویٰ ہونے کا اظہار کیا ہے، اس کے بعد اس کو ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ قرار دیا ہے، پھر اپنی تقصیر کا اعتراف فرمایا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا سر تا سر میری اپنی ہی غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے خود ہی اپنی جان پر ظلم ڈھایا، میرے رب

نے مجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْجِی الْمُؤْمِنِيْنَ (۸۸)

باوجودیکہ حضرت یونسؑ حرفِ مدعا زبان پر نہیں لائے تھے، صرف اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا تھا لیکن خدائے علام الغیوب جو پاتال کی فریادوں کو سنتا اور دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، اس نے ان کے تمام غم والم کو دور فرما دیا۔ یہاں غم والم سے صرف وہی غم والم مراد نہیں ہے جو کشتی والے حادثے کے سبب سے پیش آیا بلکہ وہ غم والم بھی ہے جس کے سبب سے انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑا تھا۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ اس حادثہ کے بعد جب انھوں نے از سرِ نو اپنی قوم کو دعوت دی تو ان کی پوری قوم ایمان لائی اور جو عذاب ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا اس سے خدا نے اس کو نجات دی۔

ایک ٹکڑا سرگزشت کو مطابقِ حال بنانے کے لیے

وَكَذٰلِكَ نُـْجِی الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یہ ٹکڑا اس سرگزشت کو مطابقِ حال بنانے کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کے سنانے سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو یہ اطمینان دلانا ہے کہ حالات کتنے ہی تاریک اور مایوس کن ہوں لیکن دل برداشتہ نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ تمھاری دعاؤں اور فریادوں کو جانتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے باایمان بندوں کو اسی طرح ہر غم والم سے نجات دیتا ہے جس طرح اس نے یونسؑ کو نجات دی۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ساری تاریکیاں، جن میں تم گھرے ہوئے ہو، کافور ہو جائیں گی، حق کا بول بالا ہوگا اور تمہاری قوم ایمان کے نور سے منور ہو جائے گی۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ (۸۹)

حضرت زکریاؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت زکریاؑ کی سرگزشت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکی ہے۔ انھوں نے بھی بظاہر نہایت مایوس کن حالات میں اپنے رب سے دعا کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ظاہری حالات کے بالکل خلاف ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ سورۂ مریمؑ کی تفسیر میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ان کی بیوی بانجھ تھیں اور وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ اعزا و اقربا سب نااہل اور دین سے بے پروا تھے۔ حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آلِ یعقوبؑ کے جس دینی ورثہ کے وہ وارث ہیں خاندان میں اس کا کوئی اہل نہیں پیدا ہوا اور خود ان کا وقتِ آخر اب سر پر آپہنچا۔ اس پریشانی میں انھوں نے دعا فرمائی کہ اے رب تو مجھے تنہا نہ چھوڑ بلکہ کوئی ایسا وارث عطا فرما جو میری اور آلِ یعقوبؑ کی دینی روایات کا حامل بن سکے۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ۔ یعنی وارث کے لیے یہ دعا جو میں کر رہا ہوں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ میرا کوئی وارث نہ ہوا تو تیرے دین کا کوئی حامل نہیں رہے گا۔ تیرا کوئی کام میرے یا میرے خاندان کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے تو اپنے دین کا بہترین وارث خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ دعا جو کر رہا ہوں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ تیرے دین کی خدمت کی جو سعادت اس خاندان کو، تیرے فضل سے حاصل رہی ہے اس سے یہ خاندان محروم نہ رہ جائے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ تو جس کو چاہے گا اس خدمت کے لیے اٹھا کھڑا کرے گا، تو کسی کا محتاج

نہیں ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ (۹۰)

حضرت زکریاؑ کی دعا ایک نہایت اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی۔ انھیں اولاد کی نہیں بلکہ دین کے ایک خدمت گزار کی تمنا تھی۔ وہ جس میراث کے حامل تھے وہ مال و جائداد کی میراث نہیں بلکہ آل یعقوبؑ کے دین کی میراث تھی اور چاہتے تھے کہ یہ مقدس امانت محفوظ رہے اس وجہ سے ان کی دعا درخورِ قبول ٹھہری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بانجھ بیوی کو اولاد کے قابل بنا دیا اور ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا نامور فرزند عطا فرمایا۔

حضرت زکریاؑ کی دعا ایک اعلیٰ دینی مقصد کے لیے تھی

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ فرمایا کہ بالکل ناموافق و نامساعد حالات کے اندر ان کی یہ دعا اس لیے درخورِ قبول ٹھہری کہ یہ لوگ دنیا کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والے نہیں بلکہ بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں سبقت کرنے والے تھے۔ 'إِنَّهُمْ' میں ضمیر جمع حضرت زکریاؑ کے خاص اہلِ بیت کے لیے ہے۔ ان کے بنی اعمام تو، جیسا کہ سورۂ مریم سے واضح ہو چکا ہے، دین سے غافل لوگ تھے لیکن خاص حضرت زکریاؑ سے وابستہ لوگ دین دار تھے۔ ان لوگوں کے اندر تنافس فی الدنیا کا روگ نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ مسابقت الی الخیر کی وہ روح باقی تھی جو آل یعقوبؑ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضرت یحییٰؑ کی ولادت سے اس روح کو ایک تازہ دم قالب حاصل ہو گیا۔

ان کی دوسری صفت یہ بتائی ہے کہ 'يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا'، وہ امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کو پکارتے تھے۔ قرآن میں دنیا داروں اور مشرکوں کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ جب ان کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تب تو وہ بڑی لمبی لمبی دعائیں ہم سے کرتے اور عہد باندھتے ہیں کہ اگر ان کی یہ ضرورت پوری ہو گئی تو ہمیشہ خدا کے وفادار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب خدا ان کی ضرورت پوری کر دیتا ہے تو گن اپنی تدبیر اور دوسروں کی کارسازی کے گاتے ہیں اور خدا کو اس طرح بھول جاتے ہیں گویا اس کو کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا کردار منافقانہ اور مشرکانہ نہیں تھا بلکہ وہ طمع اور خوف، امید اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے تھے۔ 'وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ' یعنی یہ نہیں تھا کہ نعمت ملے تو اکڑنے لگیں اور چھن جائے تو مایوس اور ناشکرے بن کر رہ جائیں بلکہ ہر حال میں وہ خدا ہی کے آگے سرافگندہ رہنے والے تھے۔

وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۹۱)

یہ حضرت مریمؑ کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ یہاں ان کا نام نہیں لیا ہے اس لیے کہ ان کی جو صفت مذکور ہوئی ہے وہ ایک ایسی صفت ہے جس کا موصوف و مصداق ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس صفت کے ساتھ ان کے اختصاص کی دلیل ہے۔

اُحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا مفہوم

'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کو اس کے عام لغوی مفہوم میں نہ لیجیے۔ 'اَحْصَنَ فَرْجَہٗ' عربی زبان میں اسی طرح کا ایک محاورہ ہے جس طرح 'سدّ الثلمة'، 'رتق الفتق'، 'جبر الکسر' وغیرہ بہت سے محاورات ہیں۔ ان محاورات میں الفاظ کے لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں بلکہ اس مفہوم کا اعتبار ہوتا ہے جس کے لیے یہ استعمال ہوتے ہیں۔ 'اَحْصَنَ فَرْجَہٗ' کا مفہوم تحصن من السوء اس نے اپنے آپ کو ہر برائی سے پاک رکھا یا خطرے سے محفوظ رکھا۔ یہ محاورہ عورتوں کے لیے جس طرح استعمال ہوا ہے اسی طرح مردوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'فرج' کے معنی لغت عرب میں اصلاً بھی 'موضع مخافة' یعنی اندیشہ کی جگہ کے ہیں۔ میں اس کے شواہد پیش کر سکتا ہوں لیکن ان سے مستفید صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی کلامِ عرب پر نظر ہو۔ کتاب کے عام قارئین ان سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔

حضرت مسیح کے روح ہونے کا مفہوم

'نَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا' یعنی خاص اپنے کلمۂ 'کُن' کے ذریعہ سے ان کے اندر ایک مولود کی روح ڈال دی۔ حضرت مسیح کا استقرار بطنِ مادر میں چونکہ عالمِ اسباب کے عام ضابطہ سے الگ صرف کلمۂ 'کن' کے ذریعہ سے ہوا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی ڈالی ہوئی روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کو اور ان کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی بھی قرار دیا گیا ہے۔ ہم سورۂ مریم کی تفسیر میں ان کے نشانی ہونے کے پہلو واضح کر چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، جیسا کہ انجیلوں سے واضح ہے، خود بھی اپنی نسبت یہی فرمایا ہے جو قرآن بیان کر رہا ہے، یہ محض پال کے پیرو عیسائیوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ سے بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان تحریفات پر آلِ عمران کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۹۲)

انبیاء کی سرگزشت، خلاصۂ بحث

تمام انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد اب بطورِ خلاصۂ بحث کے فرمایا کہ ان تمام کی دعوت اور ان کا دین ابتداء سے انتہاء تک ایک ہی ہے اور یہ سب انبیاء ایک ہی ملت و امت ہیں اور میں ہی تمہارا رب ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء کے درمیان کسی نے تفریق کی ہے، ان کے لائے ہوئے دین میں کسی نے بدعتیں ایجاد کی ہیں اور خدا کی توحید میں کسی نے شرک کی ملاوٹ کی ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔ ان نبیوں کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے۔

وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (۹۳)

خدا کے دین میں تفرق پیدا کرنے والوں کو دھمکی

یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے اس دین میں بدعتیں پیدا کر کے اس کو پارہ پارہ کیا اور اب ہر گروہ اپنی اپنی ڈگر کی حمایت میں انبیاء کے لائے ہوئے اس مشترک دین کی مخالفت کر رہا ہے جو قرآن اور خدا کے آخری رسول کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ تم ان مخالفت کرنے والوں کی کوئی پروا نہ کرو، ان سب کی واپسی بہرحال ہماری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع بننے والا نہیں ہے ہم سب کے آگے اس کا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ کسی کی کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (۹۴)

یعنی سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہوگی تو جو عمل صالح کریں گے، بشرطیکہ وہ ایمان اور توحید پر قائم ہوں، وہ اطمینان رکھیں کہ ان کی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ ہم ان کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ان کی ایک ایک نیکی کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ ان کا کوئی عمل ہماری یادداشت سے رہ جائے۔ بس یہ شرط ہے کہ وہ ایمان کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ہم اس حقیقت کی وضاحت بار بار کر چکے ہیں کہ خدا کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ صرف خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کے لیے کیا جائے۔ جو عمل خدا کے لیے نہ کیا جائے اس کی خدا کے ہاں کوڑی کے برابر بھی وقعت نہیں ہے اگرچہ وہ ہجرت و جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹۵-۱۱۲

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ انذار کے اسی مضمون کی، جس سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا، ایک نئے اسلوب سے آخر میں پھر یاددہانی فرما دی ہے اور اس خاتمہ کی تمہید بھی بعینہٖ اسی لفظ سے شروع کی ہے جس لفظ سے سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ شروع میں فرمایا تھا۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ یہاں جب اسی مضمون کو ازسرِنو لیا تو فرمایا وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ۔ اس طرح قرآن اپنے نظم کی طرف خود رہنمائی کر دیتا ہے۔ اکثر سورتوں میں یہ اسلوب موجود ہے۔ استاذ امامؒ اس اسلوب کو عود علی البدء سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سورہ کے مطالب کے پھیلاؤ میں اگر اصل مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو وہ ازسرِنو مخاطب کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۱۲

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ
يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ
الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ
كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً
مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا
يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا
مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ

خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا
يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ
لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا
فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ
اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ
اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾
اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ
لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ
وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۷ النصف

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۱۲

اور جس بستی والوں کے لیے ہم نے ہلاکت مقدر کر رکھی ہے ان کے لیے حرام ہے کہ وہ رجوع کریں۔ وہ رجوع کرنے والے نہیں بنیں گے یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب یاجوج ماجوج کھول دیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں۔ ۹۵-۹۶

اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آگیا ہے تو ناگہاں ان لوگوں کی نگاہیں ٹنگی رہ جائیں گی جنھوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! ۹۷

اب تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو جہنم کے ایندھن بنو گے، تم لازماً اس میں

داخل ہو کر رہو گے۔ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں نہ پڑتے اور اب سب اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس
میں ان پوجنے والوں کے لیے چلّانا ہو گا اور ان کے معبودوں کا حال یہ ہو گا کہ وہ کچھ نہیں سنیں گے۔ ۹۸۔۱۰۰

البتہ جن کے لیے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے وہ اس سے دور رکھے
جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ اور وہ اپنے من بھاتے عیش میں ہمیشہ رہیں گے۔
ان کو اس دن کی بڑی گھبراہٹ کا غم لاحق نہ ہو گا اور فرشتے ان کا خیر مقدم کریں گے، کہیں گے، یہ
ہے آپ لوگوں کا وہ دن جس کا آپ لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ ۱۰۱۔۱۰۳

اس دن کا خیال کرو جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق کو لپیٹتے ہیں۔
جس طرح ہم نے پہلی خلقت کا آغاز کیا اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہم پر ایک حتمی وعدہ
ہے۔ بے شک ہم یہ کر کے رہیں گے۔ ۱۰۴

اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔
بے شک اس کے اندر ہمارے عبادت گزار بندوں کے لیے بڑی آگاہی ہے۔ اور ہم نے تم کو تو بس
اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دو کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک
ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے کو اسی کے حوالہ کرتے ہو۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں نے تم سب
کو یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے، اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور ہے جس کا تم
سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ بے شک وہی جانتا ہے کھلی بات کو بھی اور اس بات کو بھی جس کو تم
چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ فرصت تمہارے لیے ایک آزمائش اور فائدہ اٹھا لینے کی
ایک مہلت ہو۔ ۱۰۵۔۱۱۱

اس نے دعا کی، اے میرے پروردگار! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے! اور ہمارا رب رحمان ہی

ہے جس سے مدد کی درخواست ہے ان باتوں کے مقابل میں جو تم بیان کرتے ہو! ۱۱۲

۱۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۹۵)

حذف کا ایک اسلوب اور فعل فیصلہ فعل کے مفہوم میں

اس آیت میں عربی کے معروف اسلوب کے مطابق ایک جزو حذف ہے جس کی وضاحت اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کے جملہ نے کر دی ہے۔ پوری بات کو کھول دیجیے تو یوں ہوگی وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنْ يَّرْجِعُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور اس میں فعل اَهْلَكْنَا، فیصلہ فعل کے مفہوم میں ہے۔ بسا اوقات جب کسی امر کی قطعیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ واقع ہو چکا۔ رجوع کے معنی یہاں باطل سے حق کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔

اشرارِ قریش سے اعراض کی ہدایت

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اشرارِ قریش کے زیادہ درپے ہونے سے روکا گیا ہے کہ اب یہ لوگ سنتِ الٰہی کی زد میں آ چکے ہیں۔ جس طرح پچھلی قومیں جو ہلاک ہوئیں، لاکھ جتن کرنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں، اسی طرح اب ان لوگوں کے لیے ایمان میں داخل ہونا حرام ہو چکا ہے اور ان کی ہٹ دھرمی کی پاداش میں ان کے لیے عذابِ الٰہی مقدر ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا زیادہ غم نہ کھاؤ، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ یہی مضمون اسی سورہ کی آیت ۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ — ان سے پہلے کوئی قوم بھی جو ہلاکت کی زد میں آئی ایمان
قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَفَهُمْ — لانے والی نہ بنی تو کیا ان سے توقع رکھتے ہو کہ یہ ایمان
يُؤْمِنُوْنَ۔ — لانے والے بنیں گے!

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (۹۶)

یاجوج و ماجوج کا غلبہ آثارِ قیامت میں سے ہے

یاجوج ماجوج پر مفصل بحث سورۂ کہف کی آیات ۹۸-۹۹ کے تحت گزر چکی ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ قیامت کے وقت، یاجوج ماجوج ہر طرف سے پل پڑیں گے اور ساری دنیا فساد سے بھر جائے گی۔ اس کی صورت کیا ہوگی؟ یہ چیز متشابہات میں سے ہے اور متشابہات کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ یہاں مقصود اس کے ذکر سے صرف یہ دکھانا ہے کہ آج جو لوگ قرآن پر ایمان لانے کے لیے مختلف قسم کی نشانیوں اور عذاب کے مشاہدہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے پیچھے اب پیغمبر کو اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ یہ لوگ عقل و فطرت کے ان دلائل سے رام ہونے والے نہیں ہیں جو قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے بلکہ یہ اسی وقت ایمان لائیں گے جب قیامت ان کے سر پر آن کھڑی ہوگی اور جس وقت ایمان لانا یا نہ لانا دونوں یکساں ہوگا۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ (۹۷)

قیامت سر پر کھڑی ہے

یعنی یہ جس وعدۂ قیامت کو بہت دور کی بات سمجھ رہے ہیں وہ بہت دور نہیں بلکہ اس کے ظہور کا وقت بہت قریب آ چکا ہے۔ سورۂ معارج میں فرمایا ہے 'إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا' (وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں لیکن ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں) انسان ہر چیز کو اپنے چھوٹے پیمانوں سے ناپتا ہے اس وجہ سے اسے قیامت بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خدائی دوران کے اعتبار سے وہ بالکل سر پر کھڑی ہے۔ یہی مضمون اس سورہ کی پہلی آیت میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے بعض دوسرے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

'فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا' یعنی وہ اچانک آ دھمکے گی اور اس کا منظر ایسا ہولناک ہوگا کہ آج جو لوگ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کی آنکھیں ٹنگی رہ جائیں گی۔ یہ خوف اور دہشت زدگی کی تصویر ہے۔ انسان جب کوئی ہولناک چیز اچانک دیکھتا ہے تو ہکا بکا ہو کر اس کو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب

'يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ' یہ اس وقت کی ان کی زبانِ حال کی تعبیر ہے اس وجہ سے یہاں 'قَالُوا' حذف کر دیا۔ فرمایا کہ وہ اس وقت خود بول اٹھیں گے کہ بیشک ہم خود ایک شدنی حقیقت سے غفلت میں پڑے رہے۔ 'بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ' یعنی یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کو کوئی اس غفلت سے بیدار کرنے والا نہ آیا ہو۔ اللہ نے بیدار کرنے والے بھی بھیجے جنھوں نے ہمیں جگانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے کہ ان کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے رہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی مسکت دلیل نہیں ہے بلکہ اصلی حجاب انسان کی غفلت ہے۔ وہ ایک حقیقت کو، اس کے دلائل کی وضاحت کے باوجود، ماننا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس کو ماننا اس کی خواہشوں کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں واحد چیز جو اس کو سہارا دیتی ہے وہ اس کی غفلت ہے۔ وہ غفلت میں پڑا ہوا اس کے لیے کسی اہتمام کو برابر ٹالتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ اس کے سر پر آ دھمکے گی۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ (۹۸)

اصنام اور ان کے پجاری دونوں جہنم میں

یعنی اس وقت ان کا یہ اعتراف ان کے لیے کچھ کارآمد نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ تم اور تمھارے یہ تمام اصنام و احجار، جن کو تم معبود بنا کے پوجتے رہے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔ 'أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ' یعنی اب روؤ یا فریاد کرو، تمھیں بہرحال ہلاکت کے اس گھاٹ پر اترنا ہے۔ اب اس سے مفر نہیں ہے۔

'وَمَا تَعْبُدُوْنَ' میں 'مَا' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اصنام و احجار ہیں جن کی مشرکینِ عرب پرستش کرتے تھے۔ 'مَا' کا استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے معروف ہے۔ ان کو جہنم کا ایندھن بنانے سے مقصود ظاہر ہے کہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں بلکہ ان کے پجاریوں کو یہ دکھانا ہے کہ جن کو معبود سمجھ کر ان کے آگے وہ ڈنڈوت کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔ مشرکینِ عرب جن فرشتوں یا جنوں کی پوجا کرتے تھے مثلاً لات، عزّٰی، منات اور ہبل وغیرہ اول تو یہ ان کے اپنے رکھے ہوئے فرضی نام تھے جن کا کوئی مسمّی سرے سے موجود ہی نہیں تھا پھر ان کی پوجا بھی وہ پتھروں کی مورتوں ہی کی شکل میں کرتے تھے۔ بعض مشرک قومیں جو انبیاؑ اور صالحین کی پرستش کرتی ہیں ان کا انجام یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ ان کے معاملات کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات میں آئی ہے۔ مثلاً عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے خلاف سیدنا مسیحؑ قیامت کے دن جو گواہی دیں گے اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح دوسرے انبیاؑ و صالحین بھی قیامت کے دن اپنے پجاریوں سے اعلانِ برارت کر دیں گے کہ ہمیں کیا خبر کہ تم ہماری پوجا کرتے رہے ہو! اگر تم نے یہ حماقت کی ہے تو اب اس کی سزا بھگتو! ہم نے تم سے کب کہا تھا کہ تم ہماری عبادت کرو۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۹۹)

اصنام کو جہنم میں ڈالنے کا مقصد

یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے یہ اصنام و احجار جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ ان کو جہنم میں ڈالنے سے اصل مقصود ان کے پوجنے والوں کو یہ دکھانا ہے کہ اگر یہ معبود ہوتے تو ان کی یہ درگت نہ بنتی! یہ ان کی تذلیل کی آخری حد ہوگی کہ جو ان کی تمام امیدوں کا آخری مرجع تھے ان کو وہ اپنی ہی طرح بے بس و مجبور اور گرفتارِ عذاب پائیں گے۔ 'وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ' یعنی یہ عابد و معبود سب ہمیشہ ہمیش کے لیے اسی جہنم میں اکٹھے رہیں گے۔ یہ قرینہ دلیل ہے کہ اس بات کا پہلا ٹکڑا تو ان کو مخاطب کر کے کہا جائے گا اور دوسرا ٹکڑا ان کے اس انجام ابدی کا اعلان ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰)

اگر التباس نہ ہو تو انتشارِ ضمیر عیب نہیں بلکہ ایجاز ہے

'زَفِيْرٌ' کے معنی آہ و فریاد اور چیخنے چلانے کے ہیں۔ اور ضمیر 'هُمْ' پہلے جملے میں میرے نزدیک پجاریوں کے لیے ہے اور دوسرے جملے میں ان کے اصنام و احجار کے لیے۔ اگرچہ اس صورت میں بظاہر انتشارِ ضمیر ہے لیکن انتشارِ ضمیر، جیسا کہ ہم جگہ جگہ مثالوں کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، عیب صرف اس صورت میں ہے جب مرجع میں التباس کا اندیشہ ہو۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو، مرجع کے تعین کے لیے واضح قرینہ موجود ہو، تو یہ عیب نہیں بلکہ ایجاز کے پہلو سے یہ کلام کا حسن ہے۔ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پجاری تو جہنم میں چیختے چلاتے اور آہ و فریاد کرتے ہوں گے اور ان بہرے پتھروں کو، جن کو انھوں نے معبود بنا کر پوجا، خبر بھی نہ ہوگی کہ کوئی آہ و فریاد کر رہا ہے اور ان سے مدد کا طالب ہے۔ یہ مضمون قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے کہ جہنمی مدد کے لیے فریاد کریں گے لیکن کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسرے

ٹکڑے میں ضمیر اور فعل دونوں وہ استعمال ہوئے ہیں جو ذی عقل ہستیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا استعمال اصنام و احجار کے لیے کس طرح موزوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضمیر اور فعل پجاریوں کے تصور کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان پتھروں کو وہ چونکہ اپنا فریاد رس اور معبود خیال کرتے تھے اس وجہ سے یہ اسلوب بیان اختیار فرمایا گیا۔ اس کی مثالیں کلام عرب اور قرآن مجید میں بہت ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (۱۰۱)

اچھے انجام والوں کے لیے بشارت

'حُسْنٰی' کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے لیے اچھے انجام کا وعدہ ہماری طرف سے پہلے سے ہو چکا ہے وہ لوگ البتہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ اس اچھے انجام کا وعدہ آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔ وہاں فرمایا ہے کہ 'جو لوگ ایمان پر قائم رہتے ہوئے عمل صالح کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کی ناقدری نہیں کرے گا بلکہ ان کے ایک ایک عمل کو وہ نوٹ کیے ہوئے ہے اور ان کے ہر عمل کا ان کو بھرپور صلہ ملنے والا ہے۔

لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا ۚ وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (۱۰۲)

ایک غلط خیال کی تردید

یعنی وہ اس جہنم سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ ان کو اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی۔ اس آیت سے ان لوگوں کے خیال کی نہایت واضح الفاظ میں تردید ہو رہی ہے جو سورۂ مریم کی آیت ۷۱ 'وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا' کے خطاب کو صحیح طور پر معین نہ کرنے کے سبب سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ العیاذ باللہ ایک مرتبہ تمام اہل ایمان کو بھی جہنم سے گزرنا پڑے گا۔ ہم نے سورۂ مریم کی آیت مذکورہ کے خطاب کو متعین کر دیا ہے اور آیت زیر بحث کی روشنی میں مفسرین کے اس عام خیال کی تردید کر کے دونوں آیتوں کی باہمی موافقت واضح کر دی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

جنت کے اندر تنوع کی آزادی

'وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ'۔ عیش، جنت ہی کا عیش سہی، اگر انسان کو اس کے اندر اپنے حسب منشا تغیر و تبدل کی آزادی حاصل نہ ہو تو اس کی یکسانی اس کو افسردہ کر دے گی اور وہ اس سے اکتا کر جی بہلانے کے لیے کسی دوسرے ماحول کا طالب ہوگا۔ انسان ایک ذی ارادہ و اختیار ہستی ہے اس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اس کی فطرت کے اس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے پیدا کر لیں گے۔ ان کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگا رنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے کہ 'لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا' (اہل جنت اپنی جنت سے ٹلنے کا نام بھی نہیں لیں گے)

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۱۰۳)

ابدی بادشاہی کی بشارت — 'فَزَعِ اکبر' سے مراد وہ عظیم ہلچل اور گھبراہٹ ہے جو نفخِ صور کے بعد تمام کائنات میں برپا ہوگی اور جس کی ہولناک تصویر قرآن نے جگہ جگہ کھینچی ہے۔ خصوصاً آخری گروپ کی سورتوں میں تو قرآن کے اعجازِ بیان نے اس طرح اس کو مصور کر دیا ہے کہ انسان دیدۂ بینا رکھتا ہو تو اس کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ اوپر آیت ۹۷ اسی کی طرف فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا کے الفاظ سے اشارہ کر رہی ہے۔ فرمایا کہ یہ عظیم ہلچل کا دن ہمارے باایمان بندوں کے لیے ذرا بھی اضطراب کا باعث نہیں بنے گا بلکہ اس دن ہمارے فرشتے اہلاً و سہلاً اور مرحبا کے نعروں سے ان کا استقبال کریں گے اور ان کو بشارت دیں گے کہ ابدی کامرانیوں کے جس مبارک دن کا، نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے، آپ لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا وہ آگیا۔ اب آپ لوگوں کو ابدی بادشاہی مبارک ہو!!

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (۱۰۴)

'سجل' اور 'کتب' کا مفہوم — 'سجل' اس دفتر یا طومار یا فائل کو کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے اوراق محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ 'کُتُب' یہاں اوراقِ نوشتہ کے معنی میں ہے۔ 'أَوَّلَ خَلْقٍ' ظرف کے محل میں ہے۔ اسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے قرآن میں بعض جگہ 'أَوَّلَ مَرَّةٍ' کا لفظ بھی آیا ہے۔

نئے آسمان اور نئی زمین — مطلب یہ کہ یہ سب کچھ اس دن ہوگا جس دن ہم اس پھیلے ہوئے آسمان کی بساط اس طرح لپیٹ کر رکھ دیں گے جس طرح طومار میں کاغذات لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں اور جس طرح ہم نے پہلی بار آسمان و زمین پیدا کیے اسی طرح ان کی جگہ نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ، نئے آسمان و زمین پیدا کریں گے۔ 'وَعْدًا عَلَيْنَا' میں مصدر تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ ہمارے ذمہ ایک حتمی وعدہ ہے۔ ہم نے اپنے نیک بندوں سے، جیسا کہ اوپر والی آیت کے الفاظ 'كُنْتُمْ تُوعَدُونَ' میں اشارہ ہے، اس کا قطعی وعدہ کر رکھا ہے جس کا ایفا ہماری ذمہ داری ہے۔ 'إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ' یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں جو ہم کر نہیں سکیں گے یا نہیں کریں گے۔ یہ ہم ضرور کریں گے، اس کا ہم نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے اور یہ ہمارے لیے ایک نہایت آسان بات ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۱۰۵)

زمین کے وارث صالحین ہوں گے — اس آیت میں زبور کا حوالہ ہے۔ زبور میں یہ بات یوں تو جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہی ہوں گے لیکن باب ۳۷ تو پورے کا پورا گویا صرف اسی ایک حقیقت کی وضاحت کے لیے مخصوص ہے اس وجہ سے ہم یہ پورا باب یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ قرآن کے حوالہ کی صحت و صداقت بھی واضح ہو جائے، یہ بھی معلوم ہو جائے کہ زمین کی وراثت سے یہاں کس زمین کی وراثت مراد ہے، نیز 'مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ' کا صحیح مفہوم بھی متعین ہو سکے کہ 'ذکر' سے یہاں کس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے ہم زبور سے حضرت داؤدؑ کا

مزمور نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس کی ان باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جو آیت زیر بحث کی وضاحت کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو۔ زبور کا باب ۳۷
اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر
کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے
اور سبزہ کی طرح مرجھا جائیں گے۔
خداوند پر توکل کر اور نیکی کر۔
ملک میں آباد رہ اور اس کی وفاداری سے پرورش پا۔
خداوند میں مسرور رہ
اور وہ تیرے دل کی مرادیں پوری کرے گا۔
اپنی راہ خداوند پر چھوڑ دے
اور اس پر توکل کر۔ وہی سب کچھ کرے گا۔
وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح
اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔
خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔
اُس آدمی کے سبب سے جو اپنی راہ میں کامیاب ہوتا
اور برے منصوبوں کو انجام دیتا ہے بیزار نہ ہو۔
قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔
بیزار نہ ہو۔ اس سے برائی ہی نکلتی ہے۔
کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے
لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔
کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔
تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہو گا۔
لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔
اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔
شریر راست باز کے خلاف بندشیں باندھتا ہے
اور اس پر دانت پیستا ہے۔

خداوند اس پر ہنسے گا
کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دن آتا ہے۔
شریروں نے تلوار نکالی اور کمان کھینچی ہے
تاکہ غریب اور محتاج کو گرا دیں۔
اور راست رو کو قتل کریں۔
ان کی تلوار ان ہی کے دل کو چھیدے گی
اور ان کی کمانیں توڑی جائیں گی۔
صادق کا تھوڑا سا مال
بہت سے شریروں کی دولت سے بہتر ہے
کیونکہ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔
لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔
کامل لوگوں کے ایام کو خدا جانتا ہے۔
ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی۔
وہ آفت کے وقت شرمندہ نہ ہوں گے
اور کال کے دنوں میں آسودہ رہیں گے۔
لیکن شریر ہلاک ہوں گے۔
خداوند کے دشمن چراگاہوں کی سرسبزی کی مانند ہوں گے۔
وہ فنا ہو جائیں گے۔ وہ دھوئیں کی طرح جاتے رہیں گے۔
شریر قرض لیتا ہے اور ادا نہیں کرتا
لیکن صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے
کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے
اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔
انسان کی روشیں خداوند کریم کی طرف سے قائم ہیں
اور وہ اس کی راہ سے خوش ہے۔
اگر وہ گر بھی جائے تو پڑا نہ رہے گا
کیونکہ خداوند اسے اپنے ہاتھ سے سنبھالتا ہے۔
میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوں

تو بھی میں نے صادق کو بے کس
اور اس کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا۔
وہ دن بھر رحم کرتا ہے اور قرض دیتا ہے
اور اس کی اولاد کو برکت ملتی ہے۔
بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر
اور ہمیشہ تک آباد رہ۔
کیونکہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے
اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔
وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔
پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔
صادق زمین کے وارث ہوں گے
اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔
صادق کے منہ سے دانائی نکلتی ہے
اور اس کی زبان سے انصاف کی باتیں۔
اس کے خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے۔
وہ اپنی روش میں پھسلے گا نہیں۔
شریر صادق کی تاک میں رہتا ہے
اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔
خداوند اسے اس کے ہاتھ میں نہیں چھوڑے گا
اور جب اس کی عدالت ہو تو اسے مجرم نہ ٹھہرائے گا۔
خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ
اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔"

اس مزمور کے بعض نمایاں پہلو

ہمارے نزدیک زبور کے اسی مزمور کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ اس مزمور پر غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے جس میں پہلے موعظت و نصیحت کی باتیں آتی ہیں پھر بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے بند کی طرح یہ بات آتی ہے کہ زمین اور ملک کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے۔ یہ اسلوب کلام قرآن کی سورۂ رحمٰن کے اسلوب سے مشابہ ہے جس میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کی ترجیع ہے۔ خط کشیدہ فقروں پر نگاہ ڈالیے تو یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ یہاں صالحین و متقین کے لیے زمین کی

جس وراثت کا ذکر ہے اس کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ وراثت ابدی ہوگی۔ مثلاً فرمایا ہے "ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی" دوسری جگہ ہے "اور ہمیشہ تک آباد رہ" تیسری جگہ ہے "وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں" چوتھی جگہ نہایت واضح الفاظ میں ہے "اور صادق زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے"۔[1] ظاہر ہے کہ یہ ابدی وراثت کی بشارت اس زمین سے متعلق نہیں ہے جس پر ہم اور آپ آباد ہیں۔ اس کی نہ تو کوئی چیز ابدی ہے اور نہ اس کی وراثت صالحین و متقین کے لیے مخصوص ہے بلکہ یہ زمین اور اس کی ہر چیز فانی ہے اور اس میں نیکوں اور بدوں دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مدت تک کے لیے یکساں مہلت بخشی ہے۔ جس کے بعد یہ آسمان و زمین دونوں فنا ہو جائیں گے اور نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ایک جہانِ نو پیدا ہوگا جس کی ابدی وراثت صالحین و متقین کو حاصل ہوگی اور اہلِ باطل جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

جہانِ نو کی وراثت صرف صالحین کو حاصل ہوگی

بعینہٖ یہی بات قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اوپر کی آیت ١٠٤ میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن اس آسمان کی بساط لپیٹ کر رکھ دے گا۔ سورۂ ابراہیم آیت ٤٨ میں آسمان و زمین دونوں سے متعلق یہ تصریح ہے کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (اس دن کو نگاہ میں رکھو جس دن زمین دوسری زمین سے اور آسمان دوسرے آسمان سے بدل دیے جائیں گے) اس بدلے ہوئے آسمان و زمین کے اندر بلاشبہ یہ قانون ہوگا کہ ان کی ابدی وراثت و بادشاہی صرف صالحین کو حاصل ہوگی۔ نافرمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ یہ بات صرف زبور اور قرآن ہی سے نہیں بلکہ تمام آسمانی صحیفوں اور تمام نبیوں اور رسولوں کی تعلیم سے ثابت ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن نے آیت زیرِ بحث میں زبور کے حوالہ سے واضح فرمایا ہے۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغماتِ الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤدؑ، جیسا کہ اسی سورہ میں بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔ جب ایک صاحبِ جبروت بادشاہ اس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اس میں مجالِ سخن کہاں باقی رہی!!

آیت کے اجزا پر ایک نظر

اس وضاحت کے بعد اب آیت زیرِ بحث کے اجزا پر غور کیجیے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ۔ اوپر زبور کے باب ٣٧ کے حوالہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن نے یہاں زبور کی جس تعلیم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس کے ایک مستقل باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، نہایت مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ اسلوبِ بیان یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل بات ترجیع و تکرار کے ساتھ اس طرح کہی گئی ہے کہ ہر بار اصل بات سے پہلے حکمت و عظمت

---

[1] ملاحظہ ہوں مزمور کے اندر خط کشیدہ فقرے۔

کی نہایت اعلیٰ باتوں کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اسی چیز کی طرف قرآن نے مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس اشارے کی اہمیت یہ ہے کہ درحقیقت یہی نصیحتیں ہیں جن پر عمل زمین کی ابدی بادشاہی کا ضامن ہے۔

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ یہ وہ اصل بات ہے جس کے لیے قرآن نے زبور کا حوالہ دیا ہے۔ زبور کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یہاں زمین سے مراد اس جہانِ نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد وجود میں آئے گی اور جس کے مالک و وارث بلا شرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (۱۰۶)

لفظ بَلَاغ یہاں منادیِ عام اور بشارتِ عام دونوں کے مضمون کا حامل ہے اور لفظ کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ فیصلہ کہ زمین کے وارث صرف خدا کے نیکوکار بندے ہی ہوں گے اس کے عبادت گزار بندوں کے لیے ایک عظیم اعلانِ بشارت ہے تو جس کو بازی کھیلنی ہو اس کے لیے بازی کھیلے، اس حیاتِ چند روزہ کے پیچھے اپنی ابدی بادشاہی کو کیوں ضائع کرے!

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۷)

یعنی اسی انذار و بشارت کے لیے ہم نے تمھیں لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے کہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دو۔ تمھارے اوپر ذمہ داری صرف بلاغ اور منادی کی ہے، تم یہ فرض ادا کر دو۔ اگر مغرور و سرکش لوگ تمھارے انذار کا مذاق اڑاتے اور اس وقت موعود کے دکھا دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ مجھے خدا نے رحمت بنا کر بھیجا ہے، عذاب بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عذاب کب آئے گا اس کے وقت کا علم صرف میرے رب ہی کو ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۸)

تم ان کو خبردار کر دو کہ مجھ پر جو وحی آئی ہے وہ یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے تو کسی اور کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ کوئی دوسرا تمھیں خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ میں نہایت زوردار تنبیہ ہے کہ بتاؤ تم اپنے آپ کو اسی ایک قادر و قیوم کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا، اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اگر تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہے اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر میری بات کا مذاق اڑاتے رہے تو میں بری الذمہ ہوا۔ اب نتائج کی ذمہ داری تمھارے اوپر ہے!!

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (۱۰۹)

فیصلہ کن تنبیہ

یعنی اگر یہ تمھاری اس فیصلہ کن تنبیہ کے بعد بھی اپنی اسی اعراض کی روش پر جمے رہیں تو ان سے کہہ دو

کہ میں نے تمہارے بڑے اور چھوٹے، لیڈر اور پیرو، امیر اور غریب سب کو بلا فرق و تمیز آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اب تم میں سے کوئی یہ عذر نہیں کر سکتا کہ اس کو خبردار نہیں کیا گیا۔ رہی یہ بات کہ جس خطرے سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں اس کے ظہور کا وقت قریب ہے یا بعید تو اس کا علم مجھے بھی نہیں ہے۔ اس کا صحیح علم صرف اس خدا ہی کو ہے جس کے حکم سے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ (۱۱۰)

تفویض الی اللہ

یہ نہایت جامع اور بلیغ کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تمہاری کھلی باتوں کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ تم اپنے پیٹوں میں چھپائے ہوئے ہو اس کو بھی جانتا ہے تو معاملہ اسی کے حوالہ ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا وہ وہی کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تم مجھ سے کیا مطالبہ کر رہے ہو اور تمہارے اس مطالبے کی تہ میں کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس وجہ سے نہیں کر رہے تھے کہ فی الواقع وہ عذاب قیامت کو ناممکن یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا سمجھتے تھے بلکہ وہ محض آپ کو زچ کرنے اور اپنے عوام کو دھوکا دینے کے لیے ایسا کرتے تھے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ خدا تمہارے دلوں کے بھید سے بے خبر ہے۔ اس پر سب کچھ واضح ہے اس وجہ سے مجھے تمہارے اس مطالبے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس کے علم اور اس کی حکمت پر پورا اعتماد ہے۔

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۱۱۱)

'لَعَلَّهُ' میں ضمیر کا مرجع وہ تاخیر وعدہ ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں ہے۔ یعنی یہ عذاب کا وعدہ جو مؤخر ہو رہا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تاخیر میں کیا بھید ہے۔ اس بھید کو خدا ہی جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو کہ خدا کی حجت تم پر اچھی طرح تمام اور تمہارا پیمانہ خوب بھر جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ابھی کچھ اور کھانے پینے کی مہلت دینا چاہتا ہو۔ بہرحال جو سبب بھی ہو اس مہلت پر مغرور ہونے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ اگر پہلی صورت ہے تو توبہ کے لیے جلدی کرو اور اگر دوسری صورت ہے تو شکر کی روش اختیار کرو۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (۱۱۲)

دعا اور وداع

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ہے اور مخالفین کو وداع بھی۔

اللہ تعالیٰ سے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ اے رب اب اس کشمکش کا تو حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور مخالفین کو آپ نے اس طرح وداع کیا کہ تم جو کچھ کہتے اور کرتے ہو میں اس کے مقابل میں اپنے رب رحمان ہی سے مدد کا طالب ہوں اس لیے کہ مستعان حقیقی وہی ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد ——— ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء